جال

ایم سلطانہ فخر

طویل ناول

جال

ایم سلطانہ فخر

گو نیم تاریکی تھی مگر اس کے باوجود بھی فواد اسے اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ وہ سرتاپا سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی صرف منہ کھلا ہوا تھا وہ بھی بھنوؤں سے لے کر آدھی تھوڑی تک۔ مگر یہ ادھ کھلا چہرہ بھی اپنے حسن جہاں سوز کے ایسے ایسے جلوے دکھا رہا تھا کہ فواد کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں اور معمول اور قاعدے سے چلنے والی دھڑکنیں اتھل پتھل سی...... دیکھیں خدارا یوں سوچنے سمجھنے میں وقت ضائع نہ کیجئے وہ مجھے ایک دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے۔ وہ عجلت اور گھبراہٹ میں بولی......

"بی بی۔"

"ہوں۔"

"یہ دودھ ہے تمہارا۔" رکھی نے دودھ کا گلاس میز پر رکھنے کی بجائے اسے ہاتھ میں تھامے تھامے پھر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانی چاہی' تو وہ جو ایک ناول کے مطالعے میں غرق تھی اس نے اچٹتی سی نظر رکھی پر ڈال کر کہا۔

"اوا چھا یہ گلاس یہاں سائیڈ ٹیبل پر رکھ دو میں بعد میں پی لوں گی۔" دودھ کے تصور ہے سے اسے متلی ہونے لگتی تھی مگر تایا اور تائی کا حکم تھا کہ وہ سوتے وقت دودھ ضرور پیے اسی لیے اس نے بے دلی سے کہا۔ مگر رکھی نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر نہیں رکھا بلکہ دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیے کچھ ایسا تاثر پیش کرتی رہی جیسے کچھ کہنے کے لیے موقع تلاش کر رہی ہو یا پھر ہمت باندھ رہی ہو لیکن وہ تو کلائمکس پر پہنچے ہوئے ناول میں اتنی مگن تھی کہ اسے احساس تک نہ ہوا کہ رکھی ابھی تک اس کے سر پر ہی ایستادہ ہے۔

"بی بی...... وہ۔" رکھی نے ادھر ادھر دیکھ کر پھر کچھ کہنا چاہا۔ تو وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ رکھی گلاس ٹیبل پر رکھ کر کب کی جا چکی ہوگی۔ اس نے ناول سے توجہ ہٹا کر رکھی کی طرف دیکھا اور گلاس اس کے ہاتھ میں دیکھ کر سخت بیزاری سے بولی۔

"بھئی کہہ دیا ماسی یہ گلاس یہاں رکھ دو ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا میں بعد میں پی لوں گی۔" اصل میں تو مطالعے میں خلل پڑ جانے کی وجہ سے وہ چڑ گئی تھی۔

"وہ...... بی بی...... پھوں دی نہی پینا۔" رکھی نے پھنسی پھنسی آواز میں آہستہ سے کہا۔

"کیوں۔" اس نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا اور رکھی اس کے سوال کرنے کے تیکھے سے انداز پر سٹپٹا سی گئی۔

"کیا تمہیں پسند نہیں میرا دودھ پینا ماسی۔" اس کی تیوری بدستور چڑھی رہی کیونکہ پہلے بھی کئی بار جب رکھی کو دودھ لانے کا اتفاق ہوتا تھا تو وہ کچھ ایسا ہی عجیب وغریب سا تاثر دیتی تھی۔

''نئی نئی بی بی ماسی تیرے صدقے ایہہ گل نہی۔'' رکھی جلدی سے سائیڈ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھ کر بولی۔
''تو پھر کیا بات ہے۔'' اس نے رکھی کی باتوں پر متجسس ہی ہو کر پوچھا۔
''وہ جی بس گل تے کوئی نہی پر توں دودھ نہ پیا کر۔'' ماسی گڑبڑا کر بولی۔
''بھئی یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیوں نہ پیا کروں۔'' وہ رکھی کے احمقانہ سے انداز پر جھلا کر بولی۔
''توں بمار (بیمار) جو رہتی ہے نا بی بی۔'' رکھی کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بات ٹال رہی ہے۔
''مگر بیماری میں تو صرف دودھ ہی سب سے عمدہ غذا ہوتا ہے۔'' وہ قدرے متعجب سے انداز میں بولی۔
''پر ایہہ دودھ نہی ایہہ دودھ تے الٹا بخار ڈال دیتا ہے۔'' رکھی نے عجیب سی صورت بنا کر کہا۔
اس کا لہجہ بھی بہت محتاط تھا۔ شاید دودھ کسی کو نقصان دے گیا ہوگا جو اسے وہم پڑ گیا ہے اس نے دل میں سوچا۔
''ہی ہی یہ خوب منطق ہے تمہاری۔'' اسے رکھی کی سادہ لوحی پر ہنسی آ گئی۔
مگر ہنسنے پر رکھی نے سہم کر ادھر ادھر دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کی اور پھر محتاط انداز میں اس کے بیڈ کے قریب بیٹھ کر بہت رازدارانہ اور سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔
''ایس دودھ وچ دوائی ملائی جاندی ہے۔ نکی نکی گلیاں (گولیاں) نی تاکہ جہر آہستہ آہستہ اثر کرے۔ ایسی لیے تے تیرے ہڈ وچ پیڑ ہوندی اے۔''
''ہیں۔'' اسماء کے جیسے سچ مچ کسی نے زہریلا نشتر چبھو دیا ہو۔ وہ اچھلنے کے انداز میں بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔
''یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماسی نہیں نہیں یہ بالکل غلط ہے۔'' وہ سخت بے یقینی کے عالم میں بولی پھر اس کے جھریوں زدہ چہرے کی طرف غور سے دیکھا مگر سوائے سراسیمگی اور سہم کے اسے کچھ نظر نہ آ سکا۔ تو اس نے رکھی سے پوچھا۔
''کہیں تم گھر میں کسی سے ناراض تو نہیں ہو۔''
''نئی بی بی میں نے بھلا کس سے نراج ہونا ہے۔''
''تو پھر کیا تمہیں میرا ادھر اپنوں میں رہنا پسند نہیں۔ یعنی تم چاہتی ہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔''
''نہیں نہیں بی بی توبہ توبہ۔'' رکھی نے کلے پیٹتے ہوئے کہا تو اس نے ایک بار پھر بڑی تیکھی اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اللہ رکھی جس کے دادا اور پردادا پشت ہا پشت سے اس کے خاندان میں ملازمت کرتے چلے آئے تھے اور جو خود بھی اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی یہیں پروان چڑھی تھی۔ چڑھتے دریا کی طرح اپنی جوانی اور پھر بیوگی کا طویل زمانہ بھی اس نے اسی گھر میں گزارا تھا۔ یہاں تک کہ حوادث زمانہ کی کڑی دھوپ نے اس کے شب دیجور کی طرح سیاہ بالوں کی

ساری سیاہی بھی اپنے اندر جذب کرلی تھی۔ اس کے سہمے سہمے سے چہرے سے نرمی اور خلوص سا جھلک رہا تھا اور گدلائی گدلائی آنکھوں میں ہمدردی اور اپنائیت کے جذبے جھلک مار رہے تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ اس کی ایک ایسی احمقانہ اور بے بنیاد بات پر کس طرح یقین کرلیتی جو اس نے بڑی رازداری برت کر کہی تھی۔

کس دل سے اور کیونکر اعتبار کرلیتی۔

جب کہ تایا اور تائی ہی نہیں بلکہ ان کے چاروں بچے بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔

اور خصوصاً تایا اور تائی نے تو اسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا رکھا تھا۔ اس کی معمولی سی معمولی بات کا بھی اس قدر خیال رکھتے تھے کہ اگر اسے ایک ذرا سی چھینک بھی آجاتی تو سب پریشان ہو اٹھتے۔

زبردستی اسے ٹھونس ٹھونس کر کھانا کھانے پر مجبور کیا جاتا۔

کھانے بھی اس قدر مقوی اور مرغن کہ اس کا وزن چند ماہ ہی میں دس پونڈ بڑھ گیا تھا۔

اور اس پر ہی بس نہیں ہوتا تھا۔

رات کو تائی اماں زبردستی اسے دودھ کا جائنٹ سائز گلاس بھی پلواتی تھیں۔

جب کہ دودھ سے وہ اس قدر الرجک تھی کہ اس کے تصور ہی سے اس کی طبیعت مالش کرنے لگتی تھی۔

مگر ایک تو تائی اماں کی بے پایاں محبت اور دلار بھرے اصرار کی وجہ سے اور دوسرے اس وجہ سے کہ دودھ کا گلاس تائی اماں بہ نفس نفیس خود لے کر آتی تھیں اور خود اپنے ہی ہاتھ سے پلاتی تھیں وہ انکار نہیں کرتی تھی اور خود اپنے ہی ہاتھ سے پلاتی تھیں۔ وہ انکار نہیں کرتی تھی البتہ ایک آدھ بار ہی ایسا اتفاق ہوا تھا کہ انہوں نے رکھی کے ہاتھ اس کا دودھ بھیجا تھا وہ بھی مجبور کے تحت کہ ایک دفعہ انہیں کسی تقریب میں جانا تھا اور ایک مرتبہ ان کے پاس ان کے میکے کا کوئی آیا ہوا تھا اور ایک مرتبہ بہت شدید قسم کا فلو ہو جانے کی وجہ سے وہ بستر سے نہ اٹھ سکی تھیں۔

مگر آج تو تائی اماں گھر میں تھیں اور بالکل بخیر و عافیت تھیں۔ کوئی مہمان یا ملنے والا بھی نہیں آیا ہوا تھا۔

اور اب انہوں نے رکھی کے ہاتھ اس کا دودھ بھیجا تھا تو رکھی نے نہ جانے کیا اول فول بک رہی تھی۔

''کہیں یہ اپنے بڑھاپے کی وجہ سے سٹھیا نہ گئی ہو۔ ورنہ یہاں کی پرانی نمک خوار ہے بلکہ پیداوار۔ سارے بچوں کو اسی نے کھلایا ہے اور باتیں ساری نمک حرامی کی کر رہی ہے۔

تایا اور تائی کی بے اندازہ اور بے پایاں محبت کا خیال آیا تو اسے تاؤ آگیا پھر بھی خود پر بہت ضبط کر کے بولی۔

''اچھا ماسی یہ بتاؤ کہ میرے دودھ میں یہ زہریلی گولیاں کون ملاتا ہے۔''

''نئی نئی بی بی یہ میں نئی بتاؤں گی کبھی بھی نئی۔'' رکھی ہولنے کے انداز میں تھوڑی سی پیچھے سرک کر بولی۔

''اچھا تم نہیں بتاؤ گی تو میں خود جا کر تائی اماں سے پوچھ لوں گی۔'' وہ گویا اسے دھمکی دیتے ہوئے بولی۔

''نئی نئی بی بی تجھے خدا واسطہ تو ملکانی سے کچھ نہیں پچھنا۔'' رکھی اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بڑے ملتجی سے انداز میں بولی۔

''تو پھر جب تم نے مجھے اتنا بتا دیا ہے کہ تو یہ بھی بتا دو تم نے تو ایک نیکی کا کام کیا ہے نا ماسی میرا مطلب ہے تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی ہے تو میں بھی تمہاری بات کو اپنے سینے میں چھپائے رکھوں گی چلو اب تو بتا دو ماسی۔'' اسے رکھی کے سفید سر اور جڑے ہوئے ہاتھوں پر ترس آ گیا تو وہ ذرا نرم پڑ کر بولی اور تب ماسی کچھ دیر تک تو شاید یہی فیصلہ کرنے میں لگی رہی کہ بتائے یا نہ بتائے پھر اس نے بیڈ کی پٹی کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

''جے ملکانی ہے نا اسی کی کارستانی ہے ساری۔'' اور تائی اماں کا نام سن کر وہ گم صم سی رکھی کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

''اور وہ جے تیرے گھار وچ جیڑا بندہ کو واسی بے چوری اپنا چھوٹا ملک سی۔'' اور اسی انکشاف پر اسے اتنے زور کا شاک لگا کہ وہ اچھل ہی پڑی۔

''وہ......وہ تیمور تھے۔'' اس نے بے یقینی سے چور چور ہوتی لڑکھڑاتی سی آواز میں پوچھا۔

''آہو جی وہی تھے۔'' رکھی نے اپنا سفید تاروں سے منڈھا سر بڑی تیزی سے ہلاتے ہوئے کہا۔

مگر......مگر......وہ بھلا کس لیے یوں چوروں کی طرح رات کو میرے گھر میں کو وے تھے۔''

''گڑ بڑ ہے۔'' اس نے بے یقینی کے بھنور میں ہچکولے کھاتے ہوئے ڈوبتے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

''جے تو مینوں معلوم نہیں پر کوئی گڑ بڑ جرور ہے۔'' رکھی نے بدستور سر ہلاتی ہوئے کہا۔

''آہو! یہ پیسے کا لوبھ وڈا کھراب ہوندا اے بی بی ملکانی تو ہے ہی تیرے کھلاف پر چھوٹا ملک بھی تیری جائیداد پر دانت لگائے ویٹھا ہے۔'' آدھی پنجابی اور آدھی اردو میں رکھی میں نے مزید انکشافات کیے تو اسے اپنے اندر ایک دم ہی زبردست توڑ پھوڑ ہوتی محسوس ہوئی اور تلملاتے ہوئے انداز میں بولی۔

''اف! یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماسی کیوں کہہ رہی ہو آخر تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہو گئی جب کہ نمک تو تم ان لوگوں کا کھاتی رہی ہو اسی گھر میں پلی بڑھی ہو کہیں یہ پٹی تمہیں ہمارے کسی دشمن نے تو نہیں پڑھائی اور کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایک اتنی سنگین بات کہنے کا انجام کیا ہو گا۔''

''ہاں ہاں معلوم ہے پر تیرا پیو بھی میرا مالک سی۔ بل کل شہزادوں جیسا۔ پر ملکانی تے اس کی جند جان دی دشمن سی۔ اوس نوں گھار سے نکلوا کے ہی چھڈیا تینوں تو پتا ہو گا نا سب۔''

''نہیں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں اور نہ معلوم کرنے کا شوق ہی ہے بلکہ میں تو یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ تم یہ سب مجھ سے کیوں کہہ رہی ہو۔'' اس نے اپنی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ڈال کر کہا۔

''توں میری جیراں ورگی ہے نا...... میری جیراں وی تیرے جیسی سونی اور چٹی سی ہور فیر میں نے تیری پیو کا بھی نمک کھایا ہے مینوں تیری جوانی پروڈا ترس آتا ہے۔ تیری جان کھترے میں ہے نا...... ایسا کر تو لاہور چلی جا......'' رکھی نے مشورہ دینے کے سے انداز میں بڑی دردمندی سے کہا۔ لیکن اسماء کو کسی طور پر بھی اس کی باتوں کا یقین نہیں آرہا تھا کیونکہ یقین کی بنیادیں تو اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ ان پر کھڑی کی جانے والی عمارت میں بڑے بڑے ہلاکت خیز لڑلے ذرا سا شگاف بھی نہیں ڈال سکتے اور اسے تو اپنے تایا تائی اور چچازادوں پر اور خصوصاً تیمور پر اندھا یقین تھا پھر وہ بھلا کس دل سے رکھی کی بے سروپا باتوں پر یقین کر لیتی وہ تو خود پر بحت ضبط کر کے رکھی کو کراس ایگزامن کر رہی تھی۔ رکھی نے اسے لاہور چلے جانے کا مشورہ دیا تو وہ تلملا ہی اٹھی اور رکھی کو بے نقط سنانا ہی چاہ رہی تھی کہ دفعتاً دروازے پر پڑا پردہ زور سے کھسکا کر اس کی تائی اماں اندر داخل ہوئیں۔ ان کی نظر پہلے سائیڈ ٹیبل پر پڑے دودھ کے گلاس پر پڑی اور پھر رکھی پر اور ان کی تیوری پر ان گنت بل پڑ گئے۔

''ہے خصموں کھانیے تو یہاں بیٹھی کیا ڈکھڑے رو رہی ہے۔ چل دفعان اٹھ یہاں سے۔'' انہوں نے رکھی کے عین سر پر پہنچ کر دانت پیس کر کچھ اس طرح کہا کہ بس مارنے کی کسر ہی رہ گئی اور رکھی جس کا رنگ ان کی آواز سن کر فق ہو گیا تھا' بڑی رحم طلب نظروں سے اسماء کی طرف دیکھتی' لرزتی اور کانپتی ہوئی بیڈ کی پٹی کا سہارا لے کر اٹھی اور مجرموں کی طرح جھکا کر باہر جانے لگی تو تائی اماں یعنی ناصرہ بیگم پھر اپنے اسی لہجے کے عالم میں بولیں۔

''اہائے تو نے تو اسماء بیٹی کو دودھ بھی نہیں پلوایا کرموں جلئے آخر تو کر کیا رہی تھی۔'' تو رکھی نے جاتے جاتے رک کر کہا۔

''کچھ وی نئی ملکانی جی وہ بی بی۔''

''چل چل در فٹے۔ آئندہ اگر یوں بیٹھ کر باتیں مٹاریں تو میں تجھے بھی تیری جیراں کے پاس پہنچا دوں گی۔'' ان کی دھتکار میں ایک دھمکی ایک غراہٹ سی شامل تھی۔ رکھی گھبرا کر باہر نکل گئی۔ اسماء کو اپنی تائی کا یہ انداز اور لب ولہجہ سخت ناگوار گزرا۔ دل میں تو پہلے ہی شک وشبہات کی کھد بد ہو رہی تھی۔ اس نے تیکھے سے انداز میں تائی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کیوں کیا رکھی کو مجھ سے بات کرنے کی اجازت نہیں تائی اماں۔'' سوال واقعی ٹیڑھا سا تھا۔ ناصرہ بیگم سٹ پٹا سی گئیں مگر پھر فوراً سنبھل کر بولیں۔

''نہیں نہیں بیٹا۔ بھلا اجازت کا کیا سوال۔ بس یہ رکھی ذرا سٹھیا گئی ہے ہمیشہ اونگی بونگی ہی بولتی ہے اور الٹی سیدھی لگانے کی تو اس کی پکی عادت ہے۔ اپنی اسی عادت کی وجہ سے خاندان برادری میں جھگڑے بھی کروا چکی ہے۔ میں تو اس کی اس عادت سے عاجز آ چکی ہوں مگر کیا کروں تو اتنی پرانی ملازمہ ہے کہ اسے گھر سے نکالنے کو دل بھی نہیں چاہتا۔'' تائی نے سخت بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

رکھی تائی کے یہاں ہی پلی بڑھی ہے اور ان سے عمر میں بھی بہت بڑی ہے ظاہر ہے وہی اس کی عادتوں سے اچھی طرح واقف بھی ہوں گی اسماء کے دل نے تائی کی باتوں پر قائل ہو کر سوچا۔ جی چاہا تائی کی بات کی تائید میں انہیں اصل بات بتا دے مگر تبھی رکھی کی وہ رحم طلب نظریں یاد آ گئیں اور زبان تک آئی بات کو پلٹ کر تھوڑا سا مسکرا کر بولی۔

''اچھا مگر وہ تو مجھ سے کسی جیراں کا ذکر کر رہی تھی جو شاید مجھ سے بہت مشابہ تھی۔''

''ہے ہے ہزار قرآن درمیان رکھی کے منہ میں خاک وہ بھلا تم سے مشابہ کیوں ہوتی۔ وہ رکھی کی سانولی اور مرگھلی سی لڑکی جو شوہر کے مظالم سہتے سہتے ٹی بی کا شکار ہو کر مر گئی۔ اس کم بخت رکھی کو رحم نہیں آیا تمہیں اس سے ملانے پر۔'' ناصرہ بیگ نے دل کر کہا تو اسماء نے رکھی کی باتوں میں آ کر ان کی طرف سے مشکوک ہو جانے پر خود کو دل ہی دل میں ملامت کی۔

''وہم کیوں آتا تائی اماں وہ جیراں کی ماں ہے اور ہر ماں باپ کو اپنی بدصورت سے بدصورت اولاد بھی خوب صورت ہی لگتی ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''ہاں وہ حبشی کی ٹوپی والا معاملہ ہوتا ہے نا اور جیراں تو اس کی اکلوتی بیٹی تھی' رکھی کا شوہر تو ٹی بی کا پرانا مریض تھا شادی کے دو تین سال بعد ہی مر کھپ گیا تھا۔ اصل میں اس نچلے طبقے میں جہالت زیادہ ہوتی ہے نا رکھی کے ماں باپ کو معلوم تھا کہ داماد ٹی بی کا مریض ہے پھر بھی رکھی کو اس کے سر منڈھ دیا۔'' ناصرہ بیگم اس کی بات پر مائل ہو کر تاسف سے بولیں۔

''جی ہاں! یہ بھی ایک زبردست المیہ ہے۔'' اسماء نے ایک سرد سی آہ بھر کر کہا۔

''ہاں وہ تو ہے مگر کیا ابھی تمہارا سونے کا اردہ نہیں۔'' تائی اماں نے پوچھا وہ ابھی تک کھڑی ہی تھیں۔

''بس یہ ناول تھوڑا سا رہ گیا ہے اسے ختم کرتے ہی سو جاؤں گی۔'' اسماء نے کہا۔

''اب درد تو نہیں محسوس ہو رہا تمہیں۔'' ناصرہ بیگم نے مزید سوال کیا۔

''جی نہیں تائی اماں اس وقت تو بالکل محسوس نہیں ہو رہا۔''

''دوا تو پابندی سے کھا رہی ہو نا۔''

''لیجیے آپ اور تیمور بھائی خود ہی تو کھلاتے ہیں۔'' اسماء نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں ورنہ تم تو ہو ہی سدا کی لاپرواہ۔ اب یہ دودھ ہی کو لے لو زبردستی پلانا پڑتا ہے ورنہ تم خود تو کبھی پیو ہی نہیں۔'' ناصرہ بیگم نے دلار بھرے انداز میں کہا اور پھر جھک کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے دودھ کے گلاس کو انگلیوں سے چھو کر دیکھا اور بولیں۔

''ارے یہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہے لیکن ابھی تو کنکنا ہے تم پی سکتی ہو۔'' انہوں نے گلاس کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں لیکن ابھی میرا دل دودھ پینے کو نہیں چاہ رہا۔'' وہ اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

''ارے لو تمہارا دل تو کبھی کچھ چاہتا ہی نہیں وہ بھی خاص طور سے دودھ پینے کو۔ خیر اگر دل نہیں بھی چاہ رہا تو ناک بند کر کے غٹا غٹ پی جاؤ چلو شاباش۔'' وہ اصرار کرنے کے سے انداز میں بولیں۔

''نہیں نہیں ابھی نہیں تائی اماں آپ پلیز یہ گلاس میز پر رکھ دیں میں یہ ناول ختم کرنے کے بعد پی لوں گی۔ اصل میں دودھ پینے کے لیے مجھے خود کو بڑی مشکلوں سے آمادہ کرنا پڑتا ہے۔'' اسماء نے ہنستے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

''مگر سفید چیز کھلی نہیں رکھتے وہ بھی خصوصاً دودھ سے بنی چیزیں۔'' ناصرہ بیگم بولیں۔

''ہائے نہیں تائی اماں یہ تو سارے توہمات ہوتے ہیں انسان کے...... چلیں ایسا ہی وہم ہے آپ کو تو میں اسے کسی چیز سے ڈھانپ دیتی ہوں۔'' گلاس تائی کے ہاتھ سے لینے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا۔

''اچھا......'' ناصرہ بیگم ڈھیلے لہجے میں بولیں۔ مگر انہوں نے گلاس اس کے ہاتھ میں نہیں دیا۔

''تم تو کچھ دیر بعد پیو گی نا۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ گرم کروا کے تمہیں بھیجے دیتی ہوں۔ ٹھنڈا دودھ نقصان دہ ہوتا ہے۔'' بظاہر تو ناصرہ بیگم نے اس کے بھلے کے لیے کہا تھا مگر ان کے انداز میں گھبراہٹ پنہاں تھی۔ لازماً اسماء کے دل میں ایک کھٹک سی ہونے لگی۔ پھر بھی اس نے کہا۔

''نہیں نہیں آپ زحمت نہ کریں تائی اماں...... بس اتنا ہی گرم کافی ہے۔''

''نہیں نہیں تم تو بدھو ہو لو بھلا اس میں زحمت کی کیا بات ہے گرم کر کے کسی کے بھی ہاتھ بھجوا دوں گی۔'' ناصرہ بیگم بولیں اور پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں اور وہ جسے خود ہی اب انہیں روکنے یا کچھ کہنے کی گنجائش نہیں نظر آ رہی تھی کچھ دیر تو دل میں ہوتی شک و شبہات کی کھٹک پر وہ قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر کسی خیال سے دوپٹہ سینے پر پھیلا کر اٹھی اور دبے دبے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل آئی۔

باہر تایا کے خاصے وسیع قدیم طرز پر بنے گھر میں نیم تاریکی میں لپٹا سناٹا کچھ پراسرار سا لگ رہا تھا۔ اصل میں رات کے ساڑھے دس بھی تو بج رہے تھے اور چونکہ بدھ کا دن تھا اور ٹی وی پر کوئی لیٹ نائٹ پروگرام بھی نہیں تھا شاید اس لیے سب دس بجے سے ہی سو گئے تھے کیونکہ سیما' صبا اور تایا ابا یعنی ملک جواد علی کے کمروں کی بتیاں بند تھیں البتہ عقبی برآمدے میں جو اسماء کے کمرے کے قریب ہی تھا ہلکے پاور کا بلب ضرور جل رہا تھا یا پھر تیمور کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اسماء کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس ارادے یا نیت سے اس وقت کمرے سے باہر نکلی ہے بس کسی انجانی سی جستجو نے ہی اس لمحے اسے کمرے سے باہر نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ کوریڈور کھلا ہوا تھا اور چھت کا پنکھا چلنے کی وجہ سے حرکت کرتا ہوا پردہ بار بار اوپر اٹھ رہا تھا اس لیے تیمور کے کمرے میں جلتی روشنی کوریڈور کے دوسرے سرے سے ہی نظر آ رہی تھی اور تیمور کے کمرے میں روشنی دیکھ کر یکبارگی اسماء کے دل کی دھڑکنیں از خود رفتہ سی ہو گئی تھیں۔ تیمور سے اس کی قلبی وابستگی ہی اتنی زبردست تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ تیمور کو ہی وہ سب کچھ بتا دے جو اس نے رکھی کی زبانی سنا ہے۔ رکھی کی شامت ضرور آئے گی مگر اس کی باتوں نے میرے اعتماد کی مضبوط دیواروں میں جو ایک لرزش سی پیدا کر دی ہے کم از کم وہ تو ختم ہو جائے گی اور پھر میں تیمور کو سختی سے منع کر دوں گی کہ وہ کسی کے سامنے رکھی کا نام نہ لیں۔ رکھی نے تو ان کو بھی اس معاملے میں ملوث کیا ہے مگر ابھی میں یہ بات تیمور کو نہیں بتاؤں گی۔ یہی سب سوچتی اسماء دبے دبے محتاط قدموں سے تیمور کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ دھڑکا بھی برابر لگا ہوا تھا کہ تائی اماں اچانک کہیں سے نکل کر سامنے نہ آ جائیں مگر جوں ہی وہ تیمور کے کمرے کے دروازے تک آئی اندر سے آتی ناصرہ بیگم کی آواز نے اسے وہیں ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تیمور سے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ واپس چلی جائے اور وہ جانے کے لیے پلٹ ہی رہی تھی کہ تبھی تیمور کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''جب اس نے کہہ دیا تھا کہ بعد میں پی لے گی تو پھر بھلا یہ گلاس اٹھا کر لانے کی کیا ضرورت تھی۔'' تیمور نے آہستہ سے کہا تھا مگر اس کی مردانہ بھاری سی آواز خاصی واضح تھی۔

''میں تو اس لیے اٹھا لائی کہ اگر دیر سے پینے میں مزا بدل جاتا تو۔'' تائی نے کہا۔

''مگر اب گرم کرنے سے تو یہ پھٹ جائے گا۔ کیا گھر میں اور دودھ نہیں ہے۔'' تیمور نے جھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''نہیں اگر ہوتا تو پھر میں تمہارے پاس کیوں آتی۔'' تائی نے جواباً کہا۔

''واہ آپ نے تو سارا کام ہی خراب کر دیا۔ آج تو اسے دودھ پلوانا بہت ضروری تھا۔ میں نے دوا کی مقدار تھوڑی سی بڑھا دی تھی۔'' تیمور بگڑے بگڑے سے انداز میں بولا۔

''تو پہلے بتایا ہوتا۔''

''پہلے اور پیچھے کیا۔ آپ روز ہی اسے دودھ پلواتی ہیں اس لیے میں نے بتانا ضروری نہ سمجھا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا رہے گا۔ ایک تو وہ دودھ سونخروں سے پیتی ہے منہ دکھ جاتا ہے میرا کہہ کہہ کر دوسرے بالکل ہٹ گئی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اب تو پیٹ کا درد بھی جاتا رہا۔'' ناصرہ بیگم نے شاید بیٹے کی خفگی کے خیال سے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے رکھی کے ہاتھ دودھ بھیجا تھا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سلو پوائزننگ کرنے میں خون آہستہ آہستہ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے اور اعضاء بھی بتدریج متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر بہت سخت جان بھی ہوتی تو زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ ماہ اور کھینچ لے گی ورنہ پندرہ دن۔'' تیمور اپنی بات کہہ کر ہنسا۔

''وہ تو ٹھیک لیکن ایک ڈیڑھ ماہ کی مدت تو بہت ہوتی ہے اگر کسی کو معلوم ہو گیا یا اسے شک ہو گیا تو۔'' ایک ڈیڑھ ماہ کی مدت ناصرہ بیگم کو بہت طویل لگی۔ انہوں نے اندیشوں میں گھر کر کہا۔

''اب فرشتے تو نہیں آئیں گے کسی کو پار سے خبر کرنے ہاں البتہ آپ کی باتوں اور حرکات سے اس کا امکان یقینی ہے۔'' تیمور چڑ کر بولا۔

''اسے لو مجھے کیا ایسا باؤلا سمجھ رکھا ہے ہاں اتنا ضرور بتائے دیتی ہوں کہ یہ کام اب میرے بس کا نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اسے تم اپنے ہاتھ میں لے لو۔'' ناصرہ بیگم بولیں۔

''نہیں، نہیں امی جان میں تو اس معاملے میں بالکل بودم ہی ثابت ہوں گا کیونکہ نہ معلوم کیوں اس کے سامنے میں خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ چنانچہ اس بات کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ تنگ آ کر اس سے صاف صاف کہہ دوں کہ تمہیں آہستہ آہستہ زہر دیتے دیتے تنگ آ گیا ہوں لہٰذا اب بہتر یہی ہے کہ تم زہر کی یہ ساری مقدار اکٹھی ہی پھانک لو۔'' اپنی بات کہہ کر تیمور زور زور سے ہنسنے لگا۔

''چل چل زیادہ بزدلی نہ دکھا۔ یہ ہنسی مخول کی بات نہیں بلکہ بہت ہی سنجیدہ اور پیچیدہ معاملہ ہے۔'' ناصرہ بیگم بیٹے کو بات ہنسی میں اڑاتا دیکھ کر چڑ سی گئیں۔

''جی ہاں جی ہاں اور سخت سنگین اور مجرمانہ بھی مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہی ہوتا رہنے دیجیے اس میں تغیر اور تبدیل کرنے کی کوشش کریں گی تو بات چھپی نہ رہ سکے گی۔''

''اچھا اچھا چل زیادہ باتیں نہ بنا آج تو خیر اس چڑیل نے سارے دودھ کا بیڑا ہی غرق کر دیا لیکن کل، کل تو اس کا منہ

چیر کر زبردستی پلوا کے رہوں گی۔" تائی نے اس طرح کہا جیسے قصہ کوتاہ کرنے کی غرض سے کہہ رہی ہوں اور وہ جو سانس روکے اور دم سادھے بے حس وحرکت سی کھڑی یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ دماغ میں بگولے سے اٹھ رہے تھے۔ پیروں تلے سے بار بار زمین کھسکتی محسوس ہو رہی تھی اور دل کی بستی تہہ و بالا ہوتی لگ رہی تھی۔

کیونکہ اندھے سے اعتماد کی گہری بنیادوں پر قائم مضبوط عمارت ہلاکت خیز زلزلوں کی زد میں آ کر ان کی آن میں ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی اور خود اس کا پورا وجود سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا قدم اٹھانے کی سکت بھی نہ رہی تھی مگر پھر بھی اپنی موجودگی کو تائی اور تیمور کی نظروں سے چھپانے کی خاطر۔ نہ معلوم کس طرح اور کیونکر وہ لہراتے اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں پہنچ ہی گئی اور خود کو کسی ہارے ہوئے زخموں سے چور چور انسان کی طرح بیڈ پر گرا دیا۔ ذہن اس قدر ماؤف تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔

بس رکھی کے کہے یہ الفاظ کہ دودھ میں دوائی ملائی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی گولیاں تاکہ زہر آہستہ آہستہ اثر کرے کی بازگشت کی طرح کانوں میں گونج رہے تھے۔ اف تو تمہیں غریب کیا گیا ہے اسماء اف کس خوب صورتی اور ترکیب سے تمہارے گرد مکر و فریب کا جال بچھایا گیا ہے۔ پھر اسماء کی آنکھوں کے پردے پر جو کچھ ہوا تھا اس کی ایک فلم سی اترنے لگی۔

"زریں۔"

"جی۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہم نے اسے اندھیرے میں رکھ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔"

"کسے۔"

"اپنی اسماء کو بھئی۔"

"ہاں مگر کیا کیا جاتا مصلحت کا تقاضا ہی یہی تھا۔"

"نہیں میں نے کسی مصلحت کی وجہ سے تو ایسا نہیں کیا تھا۔"

"تو پھر۔"

"بس کچھ خیال ہی نہیں آیا اور یہی مجھ سے بڑی چوک ہو گئی مگر کم از کم تمہیں تو بتا دینا چاہیے تھا۔"

"مجھے۔"

"ہاں ہاں حرج ہی کیا تھا آخر تم ماں ہو اس کی۔"

"ہاں ہاں ضرور ہوں لیکن پہلے آپ کی بیوی ہوں۔"

''واہ یہ کیا بات ہوئی۔''

''میرا مطلب ہے میں پہلے بھی بتانے کے حق میں تھی نہ اب ہوں۔''

''لیکن کیوں آخر کس وجہ سے۔''

''کیونکہ میں نہ چاہتی تھی کہ اسماء کے کھوٹ سے پاک صاف اور شفاف دل میں بغض وعناد کے بیج دبوؤں۔ بچوں کے دل بچپن سے ہی برے ہو جاتے ہیں تو پھر نسل در نسل ایسی منافرتیں اور مخالفتیں جنم لیتی ہیں کہ پھر ان کا کوئی توڑ ہی باقی نہیں رہتا۔''

''ہوں مگر ادھر تو بیج ہی کیا پورا جنگل آ گایا ہوگا بغض وعناد کا۔''

''ادھر والوں سے مجھے کیا غرض میں تو صرف اپنے متعلق بہت گہرائی سے سوچنے کی عادی ہوں اور پھر جس راہ پر چلنا تھا ہی نہیں اس کے پیڑ گننے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی ہمارا ماحول' رہن سہن' نظریات حتیٰ کہ مصروفیات بالکل جداگانہ ہیں۔ بھلا اتنی مہلت ہی کہاں ملتی کہ بیتی ہوئی باتوں کو دہرایا جاتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے زرین گل لیکن یہ ضروری تو نہیں تھا کہ بغض وعناد کے بیجوں سے ہی تعارف کی ابتدا کی جاتی۔''

''نہیں بالکل ضروری نہیں تھا بلکہ خود مجھے بھی پسند نہیں تھا لیکن آپ کو اسماء کی فطرت اور طبیعت کا تو بخوبی اندازہ ہوگا کہ وہ ہر بات کو اس کی تہہ میں ارکر جانچتی اور پرکھتی ہے لہٰذا اس سے یہ کہہ دینا کافی نہیں ہوتا کہ محض ناچاقی کی وجہ سے تمہارے ابو اپنے سگوں سے ترک تعلق کر بیٹھے تھے اور اس طرح کہ بیس بائیس برس گزر جانے کے بعد بھی تعلق کی یہ کٹی ہوئی ڈور جوڑی نہ جا سکی۔ اول تو یہ انکشاف ہی اس کے لیے بڑا بھاری ثابت ہوگا کہ اس دنیا میں ہمارے علاوہ اس کے کچھ سگے بھی موجود ہیں۔ دوسرے ہم دونوں جو شروع سے اسے اندھیرے میں رکھے ہوئے ہیں اس کی نظروں سے گر جائیں گے اور سب سے پہلے تو یہ پوچھتی کہ آکر اس قدر زبردست ناچاقی کی وجہ کیا تھی تو کیا میں اسے یہ بتاتی کہ غیر خاندانی ہونے سے زیادہ تمہارے ابو کے اپنی مرضی اور پسند سے شادی کر لینے پر تمہارے تایا اور تائی نے میری کتے کی سی اوا کر کے رکھ دی تھی نہ صرف یہ بلکہ جائداد میں سے تمہارے ابو کا حصہ غصب کر لینے کی وجہ سے انہوں نے تمہارے ابو کو جان سے مار ڈالنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ تو زندگی تھی جو بچ گئے تھے اور اسی وجہ سے اپنی جائداد پر لعنت بھیج کر ہمیشہ کے لیے ان لوگوں سے قطع تعلق کر بیٹھے۔''

''اوہو......اوہو بھئی تم تو ایک دم برس ہی پڑیں۔ میں خود بھی یہ کہ چاہتا تھا کہ ان ساری باتوں کا علم اسماء کو ہو۔''

''تو پھر آپ اور کیا چاہتے کیا بتاتے۔''

صرف اسی قدر کہ اپنی مرضی اور پسند سے شادی کر لینے کی وجہ سے میں نے اپنوں کی اتنی زبردستی ناراضگی مول لی ہے۔"

"واہ یعنی مجھے بیٹی کی نظروں میں گراتے۔"

"ہرگز نہیں۔ وہ پڑھی لکھی اور باشعور ہے بلکہ بیحد زیرک اور سمجھدار اور پھر زمانے کے ساتھ ساتھ طور طریق اور نظریات بھی بدل گئے ہیں وہ الٹی تم سے ہمدردی ہی محسوس کرتی۔"

"مگر آج ہی ایک دم ہی آپ کو کیا خیال آ گیا جب کہ ان لوگوں نے تو آج تک پلٹ کر ہماری خبر ہی نہیں لی۔"

"نہیں بیچ میں کوشش تو بہت کی تھی بھائی جان نے تعلقات استوار کرنے کی لیکن میں نے ہی گوارا نہیں کیا۔"

"تو پھر اب کیسے کر لیا۔"

"اپنی حالت کے پیش نظر اور یہ خیال بھی مجھے آج نہیں اسی روز ہی آ گیا تھا جب مجھ پر دل کا پہلا دورہ پڑا تھا۔"

"ارے نہیں وہ دل کا دورہ نہیں تھا زبردست قسم کا ڈپریشن ہو گیا تھا آپ کو۔"

"یوں خوب صورت بہلاوے دے کر حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش تو نہ کرو۔ میری ای سی جی رپورٹ تو آج بھی میری اسی بیماری کو گواہ ہے اور اب برس سوا برس بعد پچھلے دو تین دن سے پھر میری وہی کیفیت ہو رہی ہے۔"

"ہونہہ آپ کو تو خوانخواہ وہم ہو گیا ہے۔"

"نہیں یہ میرا وہم نہیں بلکہ حقیقت ہے جس سے تم بھی بخوبی آگاہ ہو پھر ان طفل تسلیوں سے فائدہ۔"

"فواد آپ خدارا ایسی مایوس کن باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ میرا نہیں تو کم از کم اسماء کا ہی خیال کر لیں وہ وہ بیچاری۔"

"اسی خیال سے تو کہہ رہا ہوں کہ اسے سب کچھ بتا دو کیونکہ میرا کوئی بھروسہ نہیں جانے کب بلاوا آ جائے۔"

"اف نہیں نہیں دشمنوں کا بلاوا آئے۔ آپ...... آپ یہ کیسی بدشگونی کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو خدانخواستہ کچھ نہیں ہوگا۔" بلکہ...... بلکہ آپ ہمیشہ ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رہیں گے۔"

"تم اس وقت سخت جذباتی ہو رہی ہو زرین ورنہ جو حقیقت ہے اس سے تم لاعلم نہیں ہو اور میری خواہش ہے کہ اب تم اسماء کو سب کچھ بتا دو تا کہ میرے بعد کسی غلط پیرائے میں اسماء کے کانوں تک یہ باتیں نہ پہنچ سکیں اور پھر میں نے وہاں اپنی عدالت کی اطلاع بھی بھیج دی ہے بہت ممکن ہے کہ بھائی جان خود ہی آ جائیں اور میں چاہتا ہوں کہ ان کے آنے سے پیشتر ہی اسماء کو ہر بات سے آگاہ کر دیا جائے مگر جواب دینے کی بجائے زریں ہونٹ بھینچ کر اپنے بدلیوں کی طرح امنڈتے آنسوؤں کو روکنے میں کوشاں رہیں۔"

’’دیکھو یوں میرے جیتے جی آنسو نہ بہاؤ زریں بلکہ میرے بعد بھی نہیں رونا ساری عمر تم نے جس طرح پامردی اور بہادری سے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے‘ جس خوش اسلوبی‘ فرض شناسی اور خلوص سے اس تین نفوس کو مختصر ترین گھرانے کو بہشت زار بنا رکھا ہے اسی استقلال اور بہادری سے اس نازک ترین صورت حال کا بھی مقابلہ کرو۔ بیٹی کی نظروں سے گر جانے کی فکر نہ کرو کیونکہ تمہارا ظاہر اور باطن بالکل صاف ہے اور پھر اس میں صرف تمہاری ذات ہی ملوث نہیں۔‘‘

’’نہیں نہیں فواد آج کل میرا دماغ ٹھکانے نہیں مجھ میں کچھ بھی نہیں بتایا جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خود ہی اسے بتا دیں۔‘‘ زریں گل نے پلکوں کا حصار توڑتے ہوئے اشکوں کے ریلے کو اپنے دوپٹے کے آنچل میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

’’اچھا تو پھر میں ہی بتا دوں گا اسے۔‘‘ فواد صاحب نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ ان کی طبیعت واقعی دو تین روز سے خراب تھی۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق تو کوئی تشویش ناک بات نہ تھی بس تھوڑا تھوڑا ڈپریشن سا تھا لیکن وہ دل کے عارضی میں مبتلا تھے اور دل کی اولتی بدلتی کیفیتوں سے اندازہ لگا چکے تھے کہ درحقیقت یہ دوسرے اٹیک کا پیش خیمہ ہے۔

’’مگر وہ تو اس وقت کالج گئی ہوئی ہوگی۔‘‘ انہوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

’’ہاں۔ مگر ایک گھنٹے کے اندر اندر آتی ہی ہوگی۔‘‘ زریں نے کہا اور پھر شوہر کے لیے سوپ لینے کی غرض سے اٹھ کر جانے لگیں تو انہوں نے کہا۔

’’اتنی دیر سے مسلسل باتیں کرتے رہے ہیں اب آرام کیجیے پھر فرصت سے منی کو سب کچھ بتا دیجیے گا۔‘‘

’’ہاں دیکھو اتنی فرصت ملے گی بھی یا نہیں۔‘‘

’’اُفوہ! پھر وہی باتیں۔ کیا آپ کو میرا دل دکھانا بہت اچھا لگتا ہے۔‘‘ زریں نے انہیں پیار سے گھور کر دکھی انداز میں کہا۔

’’اچھا اچھا بھئی معافی۔‘‘ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

’’ہونہہ! بس فوراً ہی اترانے لگتے ہیں۔‘‘ زریں گل نے قدرے اٹھلا کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں اور فواد باہر جاتی ہوئی مہر و وفا کی دیوی کو بڑی آزردگی سے دیکھتے رہے پھر ان کا خیال اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی کی طرف پلٹ گیا جو ایک مقامی کالج میں انٹر کی طالبہ تھی۔ اب میں اسماء کو کس طرح بتاؤں گا‘ کیونکہ بات کی ابتدا کروں گا۔ کیا دل وجان کی مالک اپنی زریں کے قصے سے ابتدا کروں یا اپنی شادی کے ذکر سے...... نہیں...... نہیں میں اسے ہر بات بتا دوں گا۔ میں اپنی عزیز از جان بچی کو کسی بات سے لاعلم نہیں رکھوں گا۔ نہ معلوم میری آنکھ بند ہونے کے بعد اسے کن حالات سے دوچار

ہونا پڑے۔ میں زریں کی طرح احتیاط اور نزاکتوں کا قائل نہیں ہوں اور یہی سوچتے سوچتے وہ پچیس برس پیشتر کے زمانے میں پہنچ گئے۔

ان کے والد کا آبائی وطن جالندھر تھا۔ ان کا شمار اونچے درجے کے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کی جائیدادیں اور زمینیں صرف جالندھر میں ہی نہیں تھیں بلکہ پٹیالہ میں ان کی خاصی وسیع جائداد تھی جنہیں ان کے چھوٹے بھائی اللہ نواز نے سنبھال رکھا تھا۔ ملک اللہ یار کی کل تین اولادیں تھیں۔ بڑا لڑکا ملک جواد اس سے چھوٹی بہن اور تیسرے نمبر پر فواد۔

ان دنوں فواد بی اے کے طالب علم تھے۔ کالج کے لڑکوں نے مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان کے لیے ایک ورائٹی شو کیا تھا۔ یوں تو فواد گھر سے کالج تک روزانہ اپنی سائیکل پر ہی آیا جایا کرتے تھے کیونکہ گھر سے کالج تک کا فاصلہ ڈھائی تین میل ہی تھا لیکن اس روز چونکہ پروگرام آرگنائز کرنا تھا اس لیے ان کا ایک ہم جماعت لڑکا اپنی کار میں انہیں لے گیا تھا۔ گو کل تین ساڑھے تین گھنٹے کا پروگرام تھا یعنی دوپہر تین بجے سے شام کے ساڑھے چھ بجے تک کا لیکن چونکہ اس روز صبح سے بارش ہو رہی تھی اس لیے بہت سے تماشائی اور پروگرام پیش کرنے والے مقررہ وقت سے بہت بعد میں آئے تھے۔ چنانچہ اس وجہ سے ساڑھے چھ کے بجائے شو یا پروگرام رات کے ساڑھے آٹھ بجے کہیں جا کر ختم ہوا تھا۔ جس ہم جماعت کے ساتھ گئے تھے اس کے جانے میں کچھ دیر تھی اور ادھر فواد پر بڑے بھائی کی خفگی کا خوف سوار تھا لہٰذا انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ راستے میں کوئی سواری پکڑ کر گھر پہنچ جائیں گے۔

ہلکی ہلکی بارش تو صبح سے ہو رہی تھی۔ فواد کالج کی عمارت سے باہر نکلے تو ایک دم ہی اس میں تیزی آ گئی۔ فواد کو بھاگ کر کالج سے متصل ایک گھر کے برآمدے میں پناہ لینا پڑی۔ اصل میں تو یہ جگہ ان کے لیے نئی نہیں تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کے آگے جست کا سائبان ڈال کر برآمدہ بنایا گیا تھا اور اسی چھوٹے سے گھر کے بائیں پہلو سے لگی سائیکلوں وغیرہ کی مرمت کرنے والے کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی جہاں سے وہ اکثر و بیشتر اپنی سائیکل کی مرمت کرایا کرتے تھے۔

وہ مکان جس کے چھوٹے سے برآمدے میں وہ کھڑے تھے اس کا ایک ہی بڑا سا دروازہ تھا جو ہمیشہ مقفل ہی نظر آتا تھا مگر گزشتہ چند روز سے وہ دیکھ رہے تھے کہ اب اس دروازے پر سرکنڈوں کی نئی چق ڈال دی گئی ہے۔ گویا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ مکان اب غیر آباد نہیں رہا ہے اور وہ تو اتفاقاً ہی یعنی محض بارش سے بچنے کے لیے وہاں جا کر کھڑے ہوئے تھے کوئی دانستہ تو نہیں کھڑے تھے اور احتیاطاً برآمدے کے سرے پر ہی کھڑے موسلا دھار بارش کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ نہ معلوم یہ بارش کب تھمے اور کتنی دیر میں کوئی سواری ملے اور کب گھر پہنچنا نصیب ہو لیکن اگر سواری ملی

ہی نہیں تو پھر کیا اس کیچڑ پانی میں پیدل ہی جانا پڑے گا اور پیدل چلنے کے خیال سے ہی ان کو پھریری آ گئی۔

پہلے تو وہ یہی سمجھے کہ ان کے کان بجے ہیں یا پھر ان کا کوئی وہم ہے اس لیے بڑھتے ہوئے قدم جو یہ آواز سن کر پل بھر کے لیے ٹھٹکے تھے پھر آگے بڑھنے لگے۔

''نہیں جناب ملک فواد صاحب۔'' آواز اب پہلے کی نسبت ذرا بلند تھی اور پھر اچنبھے کی بات یہ کہ انہیں نام لے کر پکارا گیا۔ ڈر کے مارے ان کا خون ضرور خشک ہو گیا لیکن وہ بھاگے نہیں بلکہ جہاں تک پہنچے تھے وہیں رک گئے پھر بڑی ہمت کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دروازے پر پڑی چق ہلتی ہوئی نظر آئی۔ اوہ تو اسی مکان کا کوئی مکین ہے اور میں ہوں کہ بیکار میں ڈر ہی گیا۔ مگر تبھی یہ خیال انہیں سہا کر رکھ گیا کہ آخر پکارنے والے کو ان کا نام کیسے معلوم ہوا۔ سخت تعجب کے عالم میں وہ کھنچے کھنچے چق کے نزدیک آ گئے۔

''کیا آپ مجھ سے مخاطب ہیں۔'' انہوں نے پھر بھی اپنا اطمینان کر لینے کی غرض سے پوچھا۔

''جی میں اس وقت سخت خطرے میں ہوں اور مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' جواب میں نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

''ہائیں مدد۔'' بھلا میں کسی کی کیا مدد کر سکتا ہوں میں تو ابھی اس قابل بھی نہیں۔ مدد کے سوال پر انہوں نے سٹ پٹا کر دل میں سوچا۔ پھر مری مری سی آواز میں بولے۔

''فرمایئے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''میری عزت کو یہاں سخت خطرہ لاحق ہے۔ آپ صرف مجھ پر اتنا کرم کریں کہ یہاں سے باہر نکلنے میں میری مدد کریں۔''

اف ایک تو اجنبی مقام اس پر کسی اجنبی خاتون کا پکارنا اور اس پر مستزاد مدد کی درخواست وہ بھی بھلا کس طور پر کہ اسے اس گھر سے جہاں وہ کھڑی تھی نکال کر کہیں اور پہنچانا۔ کچھ دیر کے لیے تو ان کی ایسی سٹی گم ہوئی کہ وہ کچھ بول ہی نہ سکے۔

''دیکھیں آپ کو خدا اور رسول پاک کا واسطہ۔ کسی طور پر میری مدد کیجیے۔ میری جان کو خطرہ لاحق ہوتا تو میں آپ کی مدد کے لیے کبھی نہ کہتی لیکن...... لیکن میری تو عزت خطرے میں ہے جو مجھے اپنی جان سے کہیں پیاری ہے۔ اللہ ملک صاحب آپ مجھے یہاں سے کہیں لے چلیے۔'' ابھی وہ اپنے سر پر گرتے حیرتوں کے پہاڑوں کا بوجھ سہارنے کی ہی فکر میں لگے زمین جنبد نہ جنبد گل محمد کی ہی پوزیشن میں کھڑے تھے کہ ادھر سے حواس کو مختل کر دینے والا مزید ایک مطالبہ ہوا وہ بھی التجا اور عاجزی کی لئی میں لپٹا لہٰذا ان کی تعجب اور تجسس سے سلب ہوئی گویائی جو تھوڑا بہت کچھ کہنے کو آمادہ ہوئی تھی۔ بالکل ہی مفلوج ہو کر رہ گئی۔

"دیکھیں خدارا یوں سوچنے سمجھنے میں وقت ضائع نہ کیجئے وہ مجھے ایک دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے تبھی تو آج یوں کھلا چھوڑ گیا ہے۔ وہ عورت بھی سو رہی ہے جسے وہ میری نگرانی کے لیے یہاں چھوڑ کر گیا ہے۔ خدا کے واسطے جلدی کیجئے۔" وہ عجلت اور گھبراہٹ میں حق کی اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ برآمدے میں کوئی بلب نہیں لگا ہوا تھا لیکن وہ علاقہ کافی روشن تھا۔ سڑکوں پر ایستادہ کھمبوں کی روشنیاں ابھی بارش سے متاثر نہیں ہوئی تھیں اور پھر برابر والے مکان کے برآمدے میں ہی جلتی ہوئی برقی روشنی وہاں تک آ رہی تھی جہاں وہ دونوں کھڑے تھے۔ گو نیم تاریکی تھی مگر اس کے باوجود بھی فواد اسے اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ وہ سرتاپا سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی صرف منہ کھلا ہوا تھا وہ بھی بھنوؤں سے لے کر آدھی تھوڑی تک۔ مگر یہ ادھ کھلا چہرہ بھی اپنے حسن جہاں سوز کے ایسے ایسے جلوے دکھا رہا تھا کہ فواد کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں اور معمول اور قاعدے سے چلنے والی دھڑکنیں اتھل پتھل ہی فواد کی عمران دنوں چوبیس پچیس سال کی تھی۔ یعنی چڑھتی اور منہ زور جوانی کا زمانہ تھا۔

لیکن وہ اپنی محض محرومیوں اور حالات کی وجہ سے اس منہ زور اور سرکش سے دور میں بھی ساکن جھیلوں کی مانند ٹھنڈی اور ٹھہری طبیعت کے حامل تھے۔ بڑے بھائی کا ڈنڈا ہی کچھ ایسا تھا سر پر کہ انہیں معمول سے ہٹ کر کچھ سوچنے کا بھی ہوا ونہیں پڑتا تھا جب کہ ان کے ہم عمر اور ہم مکتب ہر بات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ کالج کی ہر ایکٹیویٹی میں پیش پیش نظر آتے تھے۔

جام و مینا، حسن و رعنائی اور عشق و محبت کے قصے کہتے تھے۔ مگر وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی چنے رہتے تھے۔

وہ تو چونکہ اس دور میں اتنی بے راہروی، بے حیائی اور بیباکی نہ تھی جتنی کہ اب ہو گئی ہے۔

حالانکہ ہوتا تو اس زمانے میں بھی بہت کچھ تھا مگر ڈھکے چھپے ہی ہوتا یعنی یوں کھلے بندوں نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ اب ہو رہا ہے کیونکہ خواتین ہی نہیں مرد بھی عزت نفس، روایات کے بھرم اور بزرگوں کے احترام کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ وہ ترقی پسند ضرور تھے لیکن اپنی اسی پسندیدگی کو اپنے اصولوں اور رواجوں پر فوقیت نہیں دیتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان کے ہم جماعت اور ہم مکتب انہیں نکو نہیں بناتے تھے۔ اور انہوں نے تو اب تک کسی لڑکی کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہ تھا۔

بلکہ کبھی خیال ہی نہ آیا تھا نہ مہلت ہی ملی تھی کچھ سوچنے کی۔ ان پر تو صرف اور صرف اپنی تعلیم مکمل کر لینے کی دھن سوار تھی۔ مگر اب اچانک ہی۔ بڑے حادثاتی طور پر ایک حسین و جمیل لڑکی ان سے ٹکرائی بھی تھی تو مدد کی خواہاں بن کر۔

اور جن حالات میں ٹکرائی تھی ان سے وہ تھوڑا تھوڑا خوف سا محسوس کر رہے تھے۔

کیونکہ دھوکہ دہی، مکر و فریب اور جعل سازی تو ہر زمانے کے ساتھ ساتھ ہی چلتے آ رہے ہیں۔ وہ بھی سوچنے پر مجبور

ہو گئے کہ یہ کسی قسم کی چال تو نہیں ہے۔ اس اجنبی خاتون کو میرا نام بھی معلوم ہے۔ کیا یہ میرے خلاف پہلے سے کوئی سازش تو نہیں کی گئی۔ اف اگر اس اجنبی لڑکی نے مجھے کسی الٹے سیدھے چکر میں پھنسا دیا تو بھائی جان تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ کچھ ایسے ہی خدشات میں گھرے گم صم سے کھڑے تھے کہ اس نے پھر بہت گڑگڑا کر کہا۔

''دیکھیں مجھے غلط نہ سمجھیں میں دھوکے باز نہیں ہوں بلکہ مصیبت زدہ ہوں اور میں آپ کے سر بھی پڑنا نہیں چاہتی بس اتنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دیں جہاں میں ان درندہ صفت لوگوں سے محفوظ رہ سکوں جو لڑکیوں کو تھوک کا مال سمجھ کر فروخت کر دیتے ہیں۔'' اس نے ان کے خیالات کو کیونکر پڑھ لیا تھا انہیں سخت تعجب ہوا۔ انہوں نے بہت غور سے اس خاتون کو دیکھا چہرے سے اس کی عمر کا کچا پن صاف عیاں تھا اور خوف و حراس کے سوا کوئی دوسرا تاثر ہویدا نہ تھا۔

تب انہوں نے بھی اپنی مجبوری بیان کر دی۔

''یقین کریں خاتون میں آپ کو کسی محفوظ جگہ پہنچانے سے بالکل قاصر ہوں کیونکہ یہاں میرا کوئی دوست اور شناسا ایسا نہیں جو آپ کو اپنے گھر میں جگہ دے سکے اور آپ کو اپنے گھر میں بھی نہیں لے جا سکتا کیونکہ میرے بھائی جان بڑے سخت گیر اور غصیل ہیں اور بھاوج صاحبہ پوری جلاد صفت۔ وہ تو مجھے ہی اتنے غیر وقت گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں دیں گی تو پھر آپ کا تو کہنا ہی کیا۔'' اور ان کی بات پر لڑکی کا منہ اتر سا گیا۔

''اچھا اگر آپ کو یہاں کسی دارالامان قسم کے ادارے کا پتا معلوم ہو تو مجھے وہاں ہی پہنچا دیجیے کم از کم وہاں تو مجھے پورا پورا تحفظ ملے گا۔'' وہ لجاجت سے بولی۔

''مجھے افسوس ہے میں ایسی کسی جگہ کا پتا نہیں جانتا بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں کوئی ایسا ادارہ بھی قائم ہے۔'' وہ معذرتی لہجے میں بولے۔

''اوہ تو پھر میں کیا کروں...... کہاں جاؤں...... اچھا آپ مجھ پر اتنا احسان تو کر سکتے ہیں کہ مجھے دریا تک چھوڑ دیں کیونکہ اب تو اس کی لہریں ہی میری حفاظت کا پورا پورا سامان کر سکتی ہیں۔ دیکھیں میں مکر نہیں کر رہی' کوئی چال نہیں چل رہی بلکہ دل کی پوری صداقت سے کہہ رہی ہوں ملک صاحب خدارا میری اس درخواست کو تو رد نہ کریں۔'' اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

''معاف کیجیے گا میں اس معاملے میں بھی آپ کی مدد کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ ایک تو اس قدر طوفانی موسم ہو رہا ہے اس پر رات کا وقت کسی سواری کے ملنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے پھر بھلا پانچ چھ میل کا فاصلہ آپ کس طرح طے

کر سکیں گی۔'' انہوں نے اتنی سادگی سے کہا کہ روتی ہوئی خاتون کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ گویا اگر سواری ملنے کا امکان ہوتا تو یہ مجھے دریا تک ضرور چھوڑ دیتے۔ اف کس قدر بے غرض اور سیدھے انسان ہیں۔ اس نے دل میں سوچا اور ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عین برآمدے کے آگے ایک کار کی ہیڈ لائیٹس چمکیں اور پھر انجن بند ہونے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی تو لڑکی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

''اوہ...... دیکھیں وہ آ گیا ہے اف اب میں کیا کروں۔'' اور انہوں نے دیکھا واقعی کوئی آ گیا تھا۔ انہوں نے جواب میں اس سسکتی تڑپتی خاتون سے کچھ نہ کہا اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے برآمدے کی طرف اتر گئے پھر وہ بھاگنے کے سے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑے اسے کالج میں لے آئے۔ اس سمے قدرت کو شاید ان کی نیک نیتی اور ایک مصیبت زدہ کی مدد کرنا بھا گیا تھا۔ کالج کے احاطے ہی میں ایک خالی تانگا کینٹین کے چھجے کے نیچے کھڑا نظر آیا۔ تانگے والا بھی بارش سے بچنے کی غرض سے شیڈ کے نیچے ہی دبکا بیٹھا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی سواری ہی نے اسے کرائے پر لے رکھا تھا اور وہ سواری کی واپسی کے انتظار میں وہاں کھڑا نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی فواد نے بڑھ کر اس سے پوچھ ہی لیا۔

''کیا تانگہ خالی ہے۔''

''نئیں جی۔'' اونگتے ہوئے تانگے والے نے نہایت اکھڑ پنے سے جواب دیا اور تب اس کی خوشامد وامد کر کے اور اس خاتون کی ناسازی طبع کا بہانہ کر کے کسی طرح اسے چلنے پر راضی کر ہی لیا۔

''اچھا جی نزدیک ہی رہتے ہو اس لیے لے چلتا ہوں مگر کرایہ پانچ روپے ہوگا۔''

''ہاں ہاں پانچ روپے ہی لے لینا مگر کسی طرح ہمیں ہمارے گھر تک پہنچا دو۔'' فواد نے جلدی سے اس خاتون کے ساتھ تانگے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تو کیا آپ دریا پر نہیں چل رہے۔'' تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس خاتون نے پوچھا۔

''نہیں دریا تک یہ جانے پر کبھی راضی نہ ہوتا۔'' فواد نے کہا۔

''تو پھر کہاں جا رہے ہیں۔'' خاتون کے لہجے میں تشویش تھی۔

''میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کہاں جاؤں۔ فی الحال تو اپنے محلے کا پتا ہی دے دیا ہے۔'' وہ متفکر سے انداز میں بولے۔

''آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ کسی ہوٹل میں مجھے لے چلیں اور وہاں ایک کمرہ کرائے پر لے لیں۔'' خاتون نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں! میری اتنی استطاعت نہیں ہے کہ میں ہوٹل کا کوئی کمرہ کرایہ پر لے سکوں۔'' وہ خشک سے لہجے میں بولے۔

''آپ پیسے کی فکر نہ کریں میرے پاس خاصی معقول رقم موجود ہے اور تھوڑا سا زیور بھی۔'' خاتون نے بتایا۔

''یہ ساری چیزیں آپ اپنے پاس ہی رہنے دیں۔ میں نے ایک انتہائی سنگین قدم اٹھایا ہے تو پھر اس سے پیدا شدہ نتائج سے بھی میں خود ہی بھگت لوں گا۔'' انہوں نے کچھ عجیب اکھڑے لہجے میں کہا تو وہ خاتون پھر کچھ نہیں بولی۔ بارش کا زور تھوڑا سا ٹوٹ گیا تھا یعنی وہ دھواں اور طوفانی سی کیفیت کچھ کم ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود بھی چھاجوں پانی پڑ رہا تھا اتنی دیر میں سڑکیں بھی دریا بن گئی تھیں اور پھر تانگے والا بڑی مہارت اور چابکدستی سے تانگہ دوڑا رہا تھا۔ وہ دونوں تانگے والے سمیت بھیگ کر چوزا ہوگئے تھے۔ بالآخر خدا خدا کر کے وہ محلّہ بھی آ گیا جس کا انہوں نے تانگے والے کو پتا بتایا تھا۔ پھر ایک پرانی طرز کے کوٹھے نما مکان کے آگے انہوں نے تانگہ رکوایا۔ تانگے والے کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ تھمایا اور پھر اس اجنبی خاتون کو ساتھ لے کر مکان کا رخ کیا۔

''کیا' کیا یہ آپ کا مکان ہے۔'' خاتون نے بڑی سراسیمگی کے عالم میں پوچھا۔

''ہاں بس سر چھپانے کے لیے فی الوقت ایک عارضی ٹھکانہ ہے۔''

''لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کے بھائی اور بھاوج۔'' خاتون نے ہراساں ہو کر کہنا چاہا۔

''ہاں وہ دونوں بہت سخت بلکہ جابرانہ فطرتوں کے مالک ہیں لیکن آپ فکر نہ کریں یہ قدرت ہی کی کوئی مصلحت ہوگی کہ اس نے بیٹھے بٹھائے ناگہانی طور پر مجھے ایک خاتون کی عزت بچانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ تو اب وہی اس بات کی نبھ جانے کی بھی صورت پیدا کرے گی۔'' انہوں نے اس کی بات قطع کر کے کہا اور پھر بولے۔

''لیکن یہ ضرور ذہن نشین کر لیجئے کہ آپ اپنے بارے میں یہاں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے خواہ کوئی محبت سے پوچھے یا جبر سے اور رو ئیں رلائیں گی بھی نہیں۔'' وہ بات تو سمجھانے کے سے انداز میں کر رہے تھے مگر ان کے لہجے میں تحکم بھی تھا اور تنبیہ بھی۔

''لیکن...... لیکن آپ بلاوجہ میری ذمہ داری سر کیوں مول لے رہے ہیں۔ میرا منشا بخدا یہ نہیں تھا اور نہ ہے کہ میں کلیتاً اپنا سارا بوجھ آپ کے کاندھوں پر ڈال دوں یا آپ کے سگوں سے آپ کو بدظن کر دوں آپ اس وقت بھی چاہیں تو مجھے کسی ہوٹل کا کمرہ دلوا سکتے ہیں۔''

''نہیں ہوٹل میں آپ کی حفاظت کی میں ضمانت نہیں دے سکتا آپ آئیں تو سہی اب تو میں نے اوکھلی میں سر دے

ہی دیا ہے اب میں خدا کے سوا کسی سے خائف نہیں ہوں۔" اب کی باران کا لہجہ نہایت نرم اور یگانگت بھرا تھا۔ مرد اگر تنکے کا بھی سہارا دے تو ایک بیکس اور بے بس عورت خود کو دنیا کے مضبوط اور محفوظ ترین حصار میں جکڑا ہوا سمجھتی ہے اور یہ مرد تو اپنے ادھورے پن اور اپنے بڑے بھائی کے غیض و غضب کی پرواہ کیے بغیر عارضی طور پر ہی سہی اس حالات سے بے بس اور بددل ہو جانی والی لڑکی کو جو موت کے گلے لگانے سے بھی دریغ نہیں کر رہی تھی اتنا بڑا سہارا دے رہا تھا۔ اس نے بھی محض فواد کے ایما اور بھروسے پر اگلی ہی ساعتوں میں پیش آنے والی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنا دل مضبوط کر لیا تھا۔

فواد اسے ساتھ لیے اندر داخل ہوئے تو انہیں اپنے بھائی بہت مضطربانہ انداز میں برآمدے میں ٹہلتے نظر آئے اور ان کے کڑے تیور دیکھ کر فواد کا دل یکبارگی اس بری طرح کانپا کہ ان کے بڑھتے ہوئے قدم جم کر رہ گئے مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے بڑی سختی سے اپنی اس کمزوری پر خود کو جھڑکا اور دل مضبوط کر کے اجنبی خاتون کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔ ملک جواد کی قہر آلود نظریں ان پر پڑیں تو ان کے ساتھ ایک عورت کو دیکھ کر کچھ دیر کے لیے جم کر رہ گئیں پھر انہوں نے بڑی کراری اور پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

"تو کہاں تھا اب تک اور یہ کس کو اپنے ساتھ لگا کر لایا ہے۔" اور فواد جواب میں کیا کہتے جب کہ خود ان کو بھی علم نہ تھا کہ یہ اجنبی لڑکی کون ہے اور کیا ہے۔ انہوں نے ہراساں ہو کر ایک نظر ساتھ کھڑی لڑکی پر ڈالی جس کا آدھا کھلا چہرہ خوف سے زرد سا پڑ گیا تھا اور چہرہ جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

"ابے فالج کیوں گر گیا منہ پر بتایا کیوں نہیں کہ اس حرافہ کو کہیں سے بھگا کر لایا ہے یا اغوا کر کے۔" ملک جواد نے پھر گلا پھاڑ کر پوچھا اور ان کے ان رکیک الزامات پر فواد کا خوب صورت چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"آ...... آپ سوچ سمجھ کر بولئے بھائی جان۔ میں انہیں بھگا کر لایا ہوں نہ اغوا کر کے بلکہ یہ میری منکوحہ ہیں یعنی قانونی طور پر میری بیوی۔" فواد نے زندگی میں پہلی بار بھائی کے سامنے اس قدر دلیری سے اور تن کر بات کی تھی۔ ان کی بھابھی ناصرہ جو میاں کی دھاڑ سن کر اپنی پیتے پیتے کٹورا ہاتھ میں لیے برآمدے میں چلی آئی تھیں فواد کی بات پر مارے حیرت سے کٹورا ان کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ غصے سے بلبلا ہی اٹھیں۔

"اوہو جبھی تو میں کہوں کہ یہ روز روز تیار ہو کر پہروں گھر سے کہاں غائب رہتا ہے۔ تو یہ گل چھرے اڑا رہے تھے میاں صاحب۔ ہونہہ بڑی منکوحہ ہے بیوی ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتا کہ تیری سیاہ کاریوں نے اسے تیرے سر چپک دیا ہے جو یہ لگی لگی ساتھ چلی آئی ہے۔"

''اوہو پھر آ گئیں تم ٹپکنے کی طرح بیچ میں بولنے۔ یہ اس کی منکوحہ ہے یا آشنا یہ تو میں ابھی چٹکی بجاتے ہی معلوم کر لوں گا پہلے ذرا مجھے اس سے بات تو کر لینے دو۔''

''اے اب کیا بات کریں گے آپ اس نے تو پورے جگت بھر میں آپ کی ناک کٹوا کر رکھ دی۔ بھلا اس کی جرات تو دیکھو کہ اس فاحشہ کو یہاں بھی لے آیا جانے کون ہے کیا ہے اور جانے چکلے پر سے اٹھا کر لایا ہے یا کوڑی پر سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں غلاظت کے کیڑوں کو جلدی سے دفعان کیجئے یہاں سے۔'' ناصرہ بیگم اب شروع ہو گئی تھیں تو اب ان کو خاموش کرانا مشکل ہی تھا۔

''تم چپکی نہیں رہو گی ناصرہ۔'' وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے دھاڑے۔

''اے لو بجائی اس کے کہ ڈھنڈا لے کر موئے اس نابکار پر پل پڑیں الٹا مجھے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔'' میاں کے ڈانٹنے پر بھی ناصرہ بیگم بولے بغیر نہ رہیں مگر پھر اس کے بعد چپ ہو گئیں۔ بیوی کی باتوں سے ملک جواد مشتعل سے ہو گئے تھے۔ انہوں نے بڑے غضب ناک لہجے میں فواد سے پوچھا۔

''ہاں تو بتا تو کیا ثبوت پیش کر سکتا ہے کہ یہ تیری منکوحہ ہی ہے۔'' اس سوال پر گھڑی بھر کو تو فواد کی سٹی ہی گم ہو گئی مگر پھر انہوں نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔

''سب سے پہلا ثبوت تو یہی ہے کہ فواد اپنے بڑے بھائی جان کے سامنے کبھی کوئی جھوٹ یا غلط بات نہیں کہہ سکتا اور دوسرا وہ نکاح نامہ لیکن وہ جلدی میں ان کے گھر ہی رہ گیا ہے۔ وہ میں کل کسی وقت آپ کو لا کر دکھا دوں گا۔''

''ہونہہ سب بھٹ ماری کی باتیں ہیں کہ خود آ گئے اور نکاح نامہ بھول آئے جب کہ یہ بھی معلوم تھا کہ اسے دیکھ کر بھی ہم تمہاری یہ بات تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہ ہوتے۔'' ناصرہ بیگم سے پھر بولے بغیر نہ رہا گیا۔

''لاحول ولا قوت پتا نہیں کس مٹی کی بنی عورت ہو۔'' جواد صاحب نے پھر اپنی بیوی کو جھڑکا اور پھر فواد سے بولے۔

''مگر یہ تجھ پر چوروں اور مجرموں کی طرح چپکے سے نکاح کر کے بیٹھ جانے کی کیا مصیبت آئی تھی' کیا مار پڑ گئی تھی تجھ پر اتنی جلد شادی رچا لینے کی ابھی تو تم نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی پھر اس کو کیا بھیک مانگ کر کھلائے گا اور تیرے خیال میں میں مر گیا تھا یا تو مجھے اپنا بڑا بھائی نہیں سمجھتا تھا جو تو نے مجھ سے ذکر کیا نہ اجازت لی۔'' جواد صاحب کہہ تو بڑے غصے میں رہے تھے لیکن اب وہ تیزی اور لپک کم ہو گئی تھی ان کے لہجے میں۔

''نہیں...... نہیں۔ آپ کو اباجی کی جگہ نہ سمجھتا تو پھر انہیں آپ کی خدمت میں کیوں لاتا البتہ مجھ سے بڑی تقصیر ہو گئی کہ آپ سے اجازت نہ لے سکا اصل میں تو یہ سب نہایت اتفاقی طور پر اور عجلت میں۔''

''اے بس بس رہنے بھی دے یہ بہانے بازیاں تو تو ہے ہی ہمیشہ کا گھنا' موا نمک حرام تیری تو وہی خاصیت ہے کہ جس ہنڈیا میں کھائے اسی میں چھید کرے۔ بڑا بے چارہ مسکین صورت بنائے کھڑا ہے تو بڑے بھائی کو گردانتا ہی کہاں ہے بدبخت جا اپنا یہ غلاظت کا ڈھیر اپنے ساتھ ہی اٹھا کر لے جا اور کسی اور جگہ جا کر اس کے ساتھ اپنا منہ کالا کر۔'' ناصرہ بیگم اپنی فطرت سے مجبور تھیں وہ بولے بنا رہ ہی نہیں سکتی تھی مگر ان کی اس قدر اخلاق سے گری ہوئی گفتگو نے فواد کے تن بدن میں آگ لگادی۔ وہ دانت بھینچ کر چلائے۔

''بھائی جان آپ کے لیے بہتر یہی ہے آپ خوش رہیں میں اپنے بھائی جان سے بات کر رہا ہوں اور ہر بات کا فیصلہ ان پر چھوڑتا ہوں۔ جو کچھ یہ کہیں گے میں اس کی تعمیل میں سر جھکا دوں گا۔ یہ اگر ٹھوکریں مار کر مجھے گھر سے باہر بھی نکال دیں گے تو میں چپ چاپ نکل جاؤں گا لیکن ان کے سوا میں کسی کی کوئی بات سنوں گا نہ مانوں گا۔'' جواد صاحب کو اس کی باتوں پر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا بھائی کس فطرت اور مزاج کا حامل ہے اور کس قدر ان کی عزت اور احترام کرتا ہے اس کے باوجود بھی انہوں نے بیوی کی بات ہیٹی کرنی مناسب نہیں سمجھی اور بڑے نفرت بھرے انداز میں بولے۔

''میرا فیصلہ بھی یہی ہے کہ تو یہاں سے ابھی اور اسی وقت اپنی یہ گناہوں کی کالک' پھٹکار ماری صورت لے کر نکل جا اور تو یہاں آیا ہی کیوں۔ تجھے کس نے مشورہ دیا تھا اس چھوکری کو ساتھ لے کر آنے کا۔''

''یہ آپ کا زیرِ سایہ رہنے اور آپ کی خدمت کرنے کی بڑی خواہش مند تھیں۔ یہی ضد کر کے یہاں آئی ہیں۔'' فواد نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''اے بس بس رہنے دے یہ پھپھڑ دلاسے یہ نجس بیسوا یہاں میرے گھر میں کبھی نہیں رہ سکتی۔ لے جا اسے وہیں جہاں سے لایا تھا اور خبردار جو آئندہ تو نے کبھی اس گھر میں قدم رکھا۔'' بھائی کے کچھ کہنے سے پہلے بھاوج بھبھک کر بولیں۔ ان کی بات پر لڑکی نے تڑپ کر کچھ کہنا چاہا لیکن فواد نے اسے کچھ بولنے کا موقع نہیں دیا۔ جلدی سے خود ہی بولے۔

''تو کیا یہ آپ کا بھی حکم ہے بھائی جان۔''

''ہاں فوراً نکل جاؤ یہاں سے اس بچی کو لے کر۔'' جواد صاحب نے بھی تڑخ کر کہا۔

''بہتر ہے بھائی جان مگر چھوٹا بھائی ہونے کے ناطے اتنی اجازت اور دے دیجیے کہ میں آج رات یہاں گزار لوں کیونکہ اس طوفانی موسم میں اس وقت کسی سواری کا ملنا ممکن ہی نہیں۔'' فواد نے بھائی کے غصے کی پرواہ کیے بغیر درخواست سی کی۔

”اے جا مر یہاں سے مردو میرا بچوں کا ساتھ ہے تجھ جیسے نجس انسان کا ایک منٹ کی بھی روادار نہیں۔“ جواد صاحب کی بجائے ناصرہ بیگم نے پھر کہا۔

”نہیں نہیں آپ انہیں گھر سے نہیں نکالتے میں ابھی ابھی خود ہی چلی جاتی ہوں۔“ لڑکی کو آخر ضبط کا یارانہ نہ رہا تو وہ تڑپ کر بولی۔

”نہیں آپ کہیں نہیں جائیں گی کیونکہ اب آپ میری ہی نہیں اس گھر کی بھی عزت ہیں۔“ فواد قدرے فہمائشی انداز میں بولے اور پھر بھائی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”ہاں تو پھر بھائی جان کیا مجھے یہاں ایک رات بسر کرنے کی اجازت مل سکے گی۔“

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ رات کو اگر یہاں رکنا ہی چاہتے ہو تو پھر یہ بھی سن لو کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے دفعان ہو جانا کیونکہ یہاں محلے میں ہماری بڑی عزت ہے جسے ہم تم جیسے ننگ خاندان کی طرح خاک میں ملانا نہیں چاہتے۔“

”بہتر ہے بھائی جان میں پوچھنے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔“ فواد نے بڑی تابعداری سے کہا اور پھر اسی ڈر سے کہ بھاوج مزید کوئی روڑا نہ اٹکائیں وہ لڑکی کو ساتھ لے کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا لیکن ناصرہ بیگم میاں کی اس رعایت کو آسانی سے قبول کر لیتیں وہ فوراً ہی شروع ہو گئیں۔

”اسے تو اتنے مزے سے اجازت بھی دے دی۔ یہ بھی بھلا کسی رعایت کا مستحق تھا۔ بدمعاش...... بدبنا کہیں کا...... چپکے سے نکاح بھی کر بیٹھا اب کون جانے کہ حقیقت کیا ہے اگر چھپایا ہی تھا تو پھر کونے کھدرے میں چھپا کر رکھتا اسے اتنے طوفانی موسم میں یہاں لے کر آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ یقیناً کوئی چکر ہی ہوگا۔ آپ نے یہ تو پوچھا ہوتا کہ ایسی کیا آفت آن پڑی تھی تجھ پر یوں چپکے سے شادی رچانے کی اور کب رچائی‘ کس وقت رچائی‘ کہاں رچائی مگر آپ تو الٹے اس کی لچھے دار باتوں میں آ گئے۔ لو بھلا اب میں آپا جان کو کیا جواب دوں گی جو عرصے سے آس لگائی بیٹھی ہیں۔ مجھے اچھے طرح معلوم ہے کہ محض زبیدہ سے جان چھڑانے کو اس نے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔“

”اُفوہ! اب بس بھی کرو تمہاری زبان تو طوفان میل سے بھی زیادہ رفتار میں چلتی ہے...... (بولے عقل کی پوری) میں نے اسی لیے تو اسے گھر سے نکال دیا ہے کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری تو پھر اس سے کچھ کہنا یا پوچھنا بیکار ہی ہوتا نا۔“ جواد صاحب اپنی بیوی کے نان اسٹاپ طریقے سے اکتا کر بولے۔ اور پھر اپنے کمرے میں چل دیے۔

وہ اسے اپنے کمرے میں لے کر آئے تو کمرہ کسی فسادزدہ علاقے کا نقشہ پیش کرتا نظر آیا۔ اول تو یہ کمرہ کیا ایک

کوٹھی سی تھی جو کسی کباڑ خانے سے کم نہ تھی۔ جس کے ایک کونے میں گھر کے پرانے اور زنگ آلود کنستر نما ٹین ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے اور دوسری طرف برسوں کی جمع شدہ اخبارات کاپیوں اور کتابوں کی ردی۔ ایک کونے میں ایک پرانا گھن لگا ہوا شو ریک رکھا ہوا تھا جس کے خانوں میں شیشیاں' کپڑے' جوتے سب ہی بھرے تھے اور جس کے بالائی حصے پر جگہ جگہ سے روغن اکھڑا ہوا ایک چھوٹا سا آئینہ رکھا تھا اور شیو کا ٹوٹا پھوٹا سامان۔ ایک کونے میں صراحی' لوٹا' بالٹی' صابن دانی وغیرہ رکھی تھی اور چوتھے کونے میں جست کے نلکوں کا چھلنگا پڑا تھا جس پر بچھی بدرنگ اور بدنما دری پر میلی چیکٹ سی چادر پڑی تھی اور ایک تکیہ جس کا غلاف میل اور چکنائی کی وجہ سے موم جامع بن چکا تھا۔ پلنگ کے ارد گرد اور نیچے تک میلے کپڑے' جرابیں جوتے بکھرے پڑے تھے اور پلنگ کے سرہانے پایہ ٹوٹی تپائی پر جس کے نیچے اینٹ لگی تھی کتابوں اور کاپیوں کا ایک ٹیلہ سا بنا ہوا تھا۔ کمرے کی اس بدحالی اور زبوں خالی پر فواد خفت سے ہو کر بولے۔

''دراصل میرا یہ کمرہ تو برائے نام ہی ہے ورنہ صحیح معنوں میں یہ اسٹور روم ہی نہیں بلکہ کباڑ خانہ ہے اس پر بچے بھی اس کھیل کا میدان تصور کرتے ہیں۔ بہرحال ایک رات ہی کا تو معاملہ ہے۔'' جواب میں وہ خاموش ہی رہی اور کمرے کی بے ترتیبی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتی ہوئی ریک کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''اگر آپ مجھے کسی ہوٹل میں کمرہ دلوا دیتے تو پھر یہ نوبت ہرگز نہ آتی۔'' وہ ریک کے آگے کھڑے کھڑے بولی۔

''کیسی نوبت۔'' انہوں نے اپنے پلنگ اور فرش پر بکھری چیزیں جلد جلد سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''یہی ابھی ابھی جو آپ کو میری وجہ سے اتنا کچھ سننا پڑا۔'' اس نے کہا۔

''ارے نہیں میں تو ان باتوں کا اتنا عادی ہو گیا ہوں کہ اب مجھ پر کوئی بڑی سے بڑی بات بھی اثر نہیں کرتی۔'' انہوں نے میلے چیکٹ تکیے پر جلدی سے اپنا تولیہ پھیلاتے ہوئے کہا اور پھر اپنا گیلا چور واحد کوٹ اتار اسے کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے انہیں کچھ خیال آیا تو وہ سر کو ہلکے سے جھٹک کر بولے۔

''لیکن آج تو مجھے خود اپنے اوپر تعجب ہو رہا ہے کہ میں نے بھائی جان کے سامنے اس قدر ڈٹ کر اور اتنی دیدہ دلیری سے اتنی ساری باتیں کیسے کر ڈالیں اور وہ بھی سخت غلط بیانی پر محمول جب کہ میں معمولی معمولی باتوں پر مار کھاتا تھا' بڑی سزائیں بھگتتا تھا لیکن کبھی منہ سے اُف تک نہ کرتا تھا۔ اصل میں بھائی جان کا مجھ پر رعب ہی ایسا تھا اور بھابی جان سے تو میرے روح فنا ہوتی تھی مگر آج تو میں بالکل نہیں ڈرا۔''

''اصل میں انسان جب تک ڈرتا رہتا ہے معمولی سے معمولی کام کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کر لے تو بڑے سے بڑا کام کر گزرتا ہے۔'' وہ بدستور شو ریک کی طرف منہ کیے بولی۔

”ہاں علی ہذالقیاس۔ یعنی آج کے تجربے سے تو آپ کی بات سو فی صد درست ہی ثابت ہوتی ہے لیکن میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں کہ میرے اپنوں نے آپ سے بہت ناروا سلوک کیا ہے۔“

”لیکن میرے خیال میں تو آپ کے اپنوں نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک ہی کیا ہے۔ کیونکہ بات ہی ایسی غیر معقول اور ناقابل قبول تھی۔“ لڑکی نے جواب میں کہا۔

”بہرکیف اس انوکھے تجربے نے مجھے آج اتنا ضرور بتادیا کہ میرے اپنے کتنے پانی میں ہیں۔“ وہ تاسف بھرے انداز میں بولے۔

”آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے کاش میرے بس میں ہوتا تو میں اس کا بدل۔“

”کون سے احسان کا ذکر کررہی ہیں آپ۔“ لڑکی کی بات قطع کر کے اس کے پیچھے کھڑے ہوکر انہوں نے پوچھا۔

”یہی جو آپ نے بالکل غیر اور اجنبی ہوتے ہوئے مجھ پر کیا ہے۔“

”لیکن میں نے احسان تو نہیں ایک انسانی فریضہ ادا کیا ہے آپ نے مجھ سی مدد مانگی تھی' اپنی عزت کا تحفظ مانگا سو میں نے دے دیا اور اس کے ساتھ ساتھ یہاں لاکر خوار بھی کرایا۔“ اپنی بات کہتے کہتے ان کے دل میں اسے ڈھنگ سے دیکھنے کی خواہش جاگی جسے انہوں نے سختی سے دل ہی میں دبالیا۔

”ذلت' خواری اور دربدری کی ٹھوکریں تو اب میرا مقدر بن چکی ہیں فواد صاحب مگر مجھے رنج اور شرمندگی ہے تو اس بات پر کہ میری وجہ سے آپ بھی مشکل میں پھنس گئے اب جہاں تک مجھے یقین ہے یہ لوگ آپ کو اس گھر میں نہیں رہنے دیں گے۔“ لڑکی قدرے تردد کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

”ارے چھوڑیں یہاں کسے پرواہ ہے۔ ہم تو درویش صفت آدمی ہیں جہاں چھاؤں لگتی دیکھیں گے وہیں دھونی مار کر بیٹھ جائیں گے۔ کھانے دانے کی پرواہ بھی اس لیے نہیں کرتے کہ یہاں کھانا بھی ہمیشہ ادھر پیٹ ہی ملتا ہے ویسے یہ میرا ابھی اے کا آخری سال ہے بہرحال دو ٹیوشنیں تو لگی ہوئی ہیں دوچار اور ڈھونڈ لوں گا۔“ وہ بات کو لاپرواہی میں اڑا کر بولے۔

”اچھا اب آپ آرام کریں...... یہ میرا پلنگ حاضر ہے...... اطمینان سے اس پر لیٹ جائیں۔ چند گھنٹوں کی تو بات ہے وہ میں اوپر چھت پر گزار لوں گا۔“

”چھت پر۔“ وہ جو اتنی دیر سے خود کو ان کی نظروں سے چھپانا چاہ رہی تھی ایک دم ہی ان کی طرف گھوم کر بولی۔

”لیکن باہر تو اب بھی بارش ہورہی ہے پھر آپ چھت پر کیسے سوسکیں گے۔“ اس نے تردد سے پوچھا۔ گھبراہٹ

میں ماتھا اور تھوڑی کا نچلا حصہ کھل چکا تھا۔ وہ مبہوت سے اس پیکر حسن و جمال کو دیکھتے رہ گئے تو فوراً ہی لڑکی کو اپنی بے پردگی کا احساس ہوا اور وہ جلدی سے پھر گھوم گئی۔

''آپ...... آپ یہیں آرام سے اپنے پلنگ پر سوئیں...... میں آج کل کم ہی سوتی ہوں اور آج تو مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی۔'' اس نے پھر کہا لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز مرتعش تھی۔ وہ بھی فوراً ہی ہوش میں آ گئے تھے۔ اپنی بے ساختگی پر تھوڑا سا جھینپ کر بولے۔

''لیکن چھت پر زینے سے ملحق ایک کباڑ خانہ اور بھی ہے۔ اس کے آگے ٹین کا کافی چوڑا سا سائبان ہے اور میں اس سائبان کے نیچے ہی سوؤں گا۔ آپ اطمینان رکھیے میں بہت عادی ہوں وہاں سونے کا کیونکہ جب بھابھی جان کو کوئی سخت سزا دینا مقصود ہوتی ہے تو وہ مجھے وہیں سلواتی ہیں۔'' آخری فقرہ انہوں نے تھوڑا سا ہنس کر کہا۔ اور پھر کمرے کا دوسرا دروازہ کھول کر باہر جانے لگے تو جاتے جاتے معاً کچھ خیال آیا۔

''ارے ہاں آپ نے کچھ کھایا پیا بھی تھا یا صرف ڈر اور خوف ہی پر گزارہ کرتی رہیں۔'' انہوں نے پلٹ کر پوچھا۔

''ظاہر ہے ڈر اور خوف اتنی بھاری غذا ہوتی ہے کہ اس کے کھانے کے بعد کسی اور کھانے کو ہاضمہ قبول ہی نہیں کرتا۔'' لڑکی نے جواباً کہا۔ لہجے میں شگفتگی بھی تھی اور برجستگی بھی فواد کو بیساختہ ہنسی آ گئی۔

''اور کچھ نہیں لیکن کیا نام پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو میرا نام کیونکر معلوم ہوا۔'' آخر انہوں نے بڑی دیر سے دل میں آتے ہوئے سوال کو زبان دے ہی دی۔ انہوں نے اور کچھ کہہ کر سوال کی ابتدا کی تھی لڑکی بڑی زیرک تھی مسکرا کر بولی۔

''اور کچھ پوچھنے سے حاصل ہی کیا ہوگا البتہ آپ کا نام میں نے اس سائیکل والے کو لیتے بارہا سنا تھا۔''

''ہیں مگر کیسے۔'' آپ تو غالباً اس گھر میں آج ہی آئی تھیں۔'' انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

''نہیں اس گھر میں تو میں تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ سے رہ رہی تھی وہ باہر دروازے میں تالا ڈال جاتا تھا میں اکثر دروازے کی جھری سے باہر کا نظارہ کیا کرتی تھی اور تبھی ایک دن میں نے آپ کو دیکھا تھا پھر پھر اکثر و بیشتر دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا اور نام سے بھی واقفیت ہو گئی اب اب یہ تو محض اتفاق ہی تھا یا میری خوش نصیبی کہ آج آپ بارش سے پناہ لینے خود ہی ایک ایسے نازک وقت پر وہاں آ کھڑے ہوئے جب کہ میری جان پر بن رہی تھی۔'' لڑکی نے بہت ٹھہر ٹھہر اور جھجک جھجک کر یہ ساری تفصیل بتائی۔

☆☆☆

''ہاں جس کی حفاظت کرنی منظور ہوتی ہے قدرت اس کے بچاؤ کو خود ہی کوئی نہ کوئی سبیل نکال دیتی ہے ورنہ یقین جانیں آپ کے منہ سے اپنا نام سن کر میں تو یہی سمجھا تھا کہ کسی آسیب واسیب کا چکر ہے اور ایسی چیزوں سے تو میرا خون خشک ہوتا ہے۔'' انہوں نے جس سادگی سے سہمے سہمے انداز میں اپنی بات کہی لڑکی کو ہنسی آ گئی۔ لیکن وہ اسے ہنستا ہوا نہ دیکھ سکے کیونکہ وہ ہنوز ان کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔

''اچھا میں چھت پر جا رہا ہوں آپ دروازے کا اندر سے کھٹکا لگا لیں۔'' انہوں نے کہا اور پھر فوراً ہی باہر نکل گئے۔

وہ چھت پر پہنچے تو کباڑ خانے کی دیوار سے لگی بان کی جھلنگا چارپائی بچھا کر اس پر لیٹ گئے۔ آج سارا دن اتنے مصروف رہے تھے کہ تھکن سے سارا جسم چور چور ہو رہا تھا لیکن کچھ گیلے کپڑوں کی وجہ سے جنہیں لڑکی کی موجودگی میں تبدیل کرنا انہیں مناسب نہیں لگا تھا کچھ جھولا اور نم چارپائی کے کارن اور کچھ آج کی اچانک پڑنے والی افتاد کی وجہ سے نیند ان کی آنکھوں میں گھلنے بھی لگی تو اسے انہوں نے بھگا دیا کیونکہ نیم غنودگی کے عالم میں پل کی پل کو نیند کا کوئی جھونکا آتا بھی تو وہ فوراً ہی اسے جھٹک دیتے۔

ذہن تو طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا...... اور وہ جھونک کھا کھا کر سوچے جا رہے تھے وہی سب جو آج صرف وو ڈھائی گھنٹوں میں ان پر بیتا تھا۔

انہیں خود پر تعجب نہیں بلکہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان جیسے بودے، بے زبان اور ادھورے سے انسان نے اتنا بڑا اقدام کیسے کر لیا۔

ان میں اتنی ہمت اور حوصلہ کیونکر پیدا ہوا کہ وہ ایک اجنبی لڑکی کو ایسے طوفانی موسم میں اور اتنی رات گئے گھر لے آئے اور اتنی جرات کیسے ہوتی کہ اسے اپنی منکوحہ ظاہر کر کے بلا خوف وخطر اپنے سخت گیر بلکہ سنگدل بھائی اور ظالم وجابر بھاوج کے سامنے ڈٹ کر بات بھی کر لی اور اب سکون سے حالات پر غور کرنے کا موقع ملا تھا تو وہ سوچ رہے تھے کہ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس اجنبی لڑکی پر کون سے افتاد پڑی ہے۔

اور وہ کون ہے کیا ہے۔

کن عادات اور کیسے چال چلن کی مالک ہے۔

حتیٰ کہ انہیں تو اس کا نام تک نہ معلوم تھا۔

کہیں لڑکی نے میرے ساتھ یہ کوئی چال نہ چلی ہو۔

مجھے کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش نہ کی ہو۔

اب یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا کہ وہ مجھے مقفل دروازے کی جھریوں سے جھانک کر دیکھا کرتی تھی۔

اور یوں اسی میرا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔

جب کہ وہ مکان تو ایک عرصے سے غیر آباد پڑا تھا۔

اور دن کے وقت ہی نہیں مجھے تو اکثر و بیشتر شام کو بھی اس کے آگے سے گزرنے کا اتفاق ہوتا رہا تھا۔

ہمیشہ مکان کو تاریک اور دروازے کو مقفل ہی دیکھا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا تھا کہ سائیکل کی مرمت کرانے کے دوران کچھ دیر کے لیے میں برآمدے کی سیڑھی پر بھی جا بیٹھتا تھا۔

زندگی تو بہر حال ایک تحریک کا نام ہے تو پھر مجھے مکان کے اندر سے کسی حرکت کا تو احساس ہوتا۔

اور اب میں نے سب سے بڑی حماقت یہ کی کہ بھائی اور بھابی جان کے سامنے اسے اپنی منکوحہ ظاہر کر کے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو ایک مشکل میں پھنسا دیا۔

مگر نہیں نہیں شکل و صورت سے تو وہ بہت معصوم نظر آتی ہے۔

عمر میں بھی کچھ زیادہ نہیں لگتی یہی انیس بیس برس کی معلوم ہوتی ہے۔

اور گفتگو بھی بہت شائستہ انداز میں کرتی ہے۔

فلسفیانہ اور سمجھ داری کی خاصی پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ کمرے میں آتے ہی مجھ سے اجتناب بھی برتتی رہی اور جب تک میں کمرے میں موجود رہا وہ رخ پھیرے ہی کھڑی رہی۔

اگر کوئی ایسی ویسی ہوتی تو الٹا مجھے ناز و انداز دکھا کر پرچانے کی کوشش کرتی۔

میں نے اسے منکوحہ کہا تھا تو وہ میری اس یاوہ گوئی کو میری کمزوری سمجھ کر کچھ تو جتانے کی کوشش کرتی۔

یا جب میں نے کہا تھا کہ صرف ایک رات ہی کا تو معاملہ ہے تو وہ کہتی کہ یہ رات ختم ہونے کے بعد میں کہاں جاؤں گی۔ کسی گھر میں پناہ لوں گی۔

مگر اس نے اشارتاً کنایتاً بھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔

حتیٰ کہ ایسا کوئی تاثر تک نہیں دیا۔

بلکہ خود میری ذات کو بھی ذرا سی اہمیت نہیں دی۔

بہر حال اس کے تحفظ کی ذمہ داری قدرت نے مجھے سونپی ہے اور اصولاً تو مجھے اس ذمہ داری کو احسن طریق پر نبھانا چاہیے۔

لیکن میں اس معاملے میں کس قدر بے بس اور مجبور ہوں کہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔
ایک نما کمرہ ملا ہوا تھا تو اس کی مدد کرنے کے جرم میں وہ بھی مجھ سے چھن گیا۔
کون جانے کہ اب کہاں بسیرا کرنا پڑے۔
فٹ پاتھ یا کسی دکان کے تھڑے پر۔
یا پھر پرانی کھنڈرات کے کسی ویران گوشے میں۔
اسکی اس بات میں کس قدر سچائی اور وزن تھا کہ انسان جب تک ڈرتا رہا ڈھنگ سے ایک معمولی سا کام بھی نہیں کر سکتا۔
لیکن وہ اگر اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کرے تو بڑے سے بڑے طوفانوں سے ٹکر لے سکتا ہے۔
اور اب میں نے اپنے اندر ہمت تو پیدا کر لی ہے کہ خود اپنا کفیل بن کر رہ سکوں۔
لہٰذا اب میں بھائی اور بھابھی کا محکوم بن کر اس گھر میں نہیں رہوں گا جہاں مجھے بچپن سے لے کر اب تک ذلت اور نفرت ہی ملی ہے۔
اور اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو میں اور وہ ایک کشتی کے سوار ہیں۔
وہ بھی اس دنیا میں تہی دست' بے بس اور تنہا ہے......اور میں بھی......بس فرق ہے تو صرف اصناف کا۔
کہ وہ لطیف اور بلور کی طرح نازک شے ہے اپنی موتی کی آب جیسی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔
پھر میں بھی کیا کروں میں اس کی وجہ سے اپنے مستقبل اور اپنے آدرش کو تباہ تو نہیں کر سکتا۔
بارش کی شدت میں گو کمی آ گئی تھی مگر وہ اب بھی برسے ہی جا رہی تھی۔ وہ نیند کے جھولے میں ہلکورے لیتے یہ سب سوچے جا رہے تھے کبھی کوئی ہوا کا تیز جھونکا پانی کی بوچھاڑ ان کی طرف اچھال دیتا تو نیند ہرن ہو جاتی۔
کہتے ہیں کہ غنودگی بھی نیند کی ایک شکل ہی ہوتی ہے اور خاموش لیٹ کر صرف غنودگی کے عالم میں وقت گزار کر بھی انسان اپنی فطری نیند پوری کر لیتا ہے لیکن وہاں تو دماغ پر ایک بوجھ سا غالب تھا۔ رات کی آخری ساعتوں میں جب بارش کا زور بالکل ہی ٹوٹ گیا تو ان سے لیٹا بھی نہ گیا وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے ایک بے چینی سی ان پر غالب تھی جو لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی اور جس نے کچھ دیر بعد انہیں اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ترشح اب بھی بدستور جاری تھا۔ وہ ننھی ننھی بوندوں میں بڑی دیر تک ٹہلتے رہے پھر جوں ہی کسی مرغ کی پہلی بانگ سنائی دی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ کمرے کا دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا جسے کھول کر وہ اندر آئے تو انہوں نے چالیس واٹ کے بلب کی زرد روشنی میں دیکھا وہ دوسرے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔

اسے یوں چوروں کی طرح چپکے سے باہر نکلتے دیکھ کران کے دل میں بہت سے شکوک رینگنے حالانکہ یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کباڑ خانے نما کمرے میں کوئی ایک بھی کام کی ایسی چیز نہیں ہے جس کے چرالینے سے کسی کا تھوڑا سا بھی بھلا ہو جائے۔ پھر بھی یہ انسانی فطرت ہوتی ہے کہ وہ بلاسبب ہی بدگمان ہو جاتا ہے۔

''یوں اس طرح چوری چھپے فرار ہونا کوئی معقولیت تو نہیں۔'' انہوں نے تیزی سے اس کے نزدیک جا کر کہا۔ لہجے میں بھی خاصی کھنک تھی۔

اور ان کی بات پر وہ تیزی سے ان کی طرف گھومی۔ تعجب سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''آپ نے میرے متعلق بہت غلط اندازہ لگایا۔ بہر حال میں آپ کے سامنے موجود ہوں آپ بخوشی میری تلاشی لے سکتے ہیں۔ یہ دیکھئے میرے پاس اس پوٹلی کے سوا کچھ بھی نہیں کہ یہی میری کل متاع ہے۔ اس میں میرے چند قیمتی زیورات ہیں اور دس ہزار روپے کی رقم بھی مگر یقین جانئیں چوری کی ہرگز نہیں ہے۔'' اف گھڑوں پانی نہیں بلکہ پانی کی تیز رو آبشار تھی جو اس کے لب و لہجے اور گفتگو کی صورت میں ان پر آن پڑی۔

''اوہ...... بہت سے معاملوں میں انسان اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے محترم خاتون۔ حالانکہ اس تباہ حال کمرے میں تو شاید آپ کے کسی ملازم کے مطلب کی بھی کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی لیکن آپ کو یوں ٹوکنے سے میرا یہ مقصد ہرگز نہ تھا بلکہ میں تو آپ کے یوں بتائے بغیر اتنی خاموشی سے چلے جانے کا شکوہ کر رہا تھا۔'' انہوں نے خجالت آمیز لہجے میں اپنی صفائی پیش کی۔

''لیکن اس کے سوا میرے لیے کوئی چارہ بھی تو نہیں رہا تھا۔ میں جو اچانک آپ کے سر پڑ گئی تھی مستقلاً آپ کے گلے کا ہار تو بننا نہیں چاہتی تھی اور نہ مجھے یہ گوارا تھا کہ میری وجہ سے آپ بھی بے ٹھکانہ ہو جائیں اس لیے یہی مناسب سمجھا کہ اس سے پہلے آپ نیچے آئیں...... میں یہاں سے چل دوں۔'' اف اب تو صاف ظاہر تھا کہ وہ انہیں کسی مشکل میں پھنسانے کی غرض سے ان کے گلے نہیں پڑی تھی۔

''لیکن میں بھی تو اب اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور آپ کو اس کا بخوبی علم ہے پھر آپ نے کم از کم میرے اوپر سے اترنے کا انتظار تو کیا ہوتا۔'' انہوں نے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔ تو وہ اندر آتی ہوئی بولی۔

''لیکن انتظار کرنے سے حاصل ہی کیا ہوتا کیونکہ یہاں سے باہر نکل کر ہماری راہیں جدا ہو جاتیں ہاں البتہ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ضرور رکنا چاہیے تھا۔'' اور وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکے کہ خود ان کی زندگی کا یہ پہلو بہت کمزور تھا۔

"لیکن میری ناقص رائے یہ ہے کہ آپ کو فی الوقت اس گھر کو خیر باد نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اس طرح آپ کو اپنا مستقبل سنوارنے میں بڑی دشواری پیدا ہو جائے گی اور بقول خود آپ کے اس گھر کے مکینوں کے سلوک کے آپ شروع ہی سے عادی ہیں تو پھر یہ اچانک اتنا اٹل فیصلہ کیسا۔" لڑکی نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا۔

"مگر یہ اٹل فیصلہ تو گزشتہ رات ہی ہو گیا تھا جب میں نے بھائی اور بھائی جان کے سامنے اتنا سنگین جھوٹ بول کر آپ کو اپنی منکوحہ ظاہر کیا تھا تو کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ یہ کوئی معمولی بات ہے۔ میں اگر یہاں تنہا رہا تو یہ لوگ میری زندگی اجیرن کر دیں گے اور یہی سمجھیں گے کہ میں صرف ایک رات کے لیے ایک الہڑ حسینہ کو خرید کر لایا تھا۔ معاف کیجئے گا آپ کے مخلصانہ مشورے پر مجھے اس قدر کھل کر یہ سب کچھ کہنا پڑ رہا ہے۔" انہوں نے بات کے اختتام پر معذرت بھی کر ڈالی۔

"اوہ تو پھر واقعی میری وجہ سے آپ کو بڑی زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

"نہیں میں نے کہہ تو دیا کہ میں ان ساری باتوں کا عادی ہوں لیکن' آپ یہ بتایئے کہ کیا رات ہی رات میں آپ نے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کر لیا ہے جہاں آپ کو پورا پورا تحفظ مل سکے۔" انہوں نے بھی دہلیز چھوڑ کر کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!" لڑکی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔" انہوں نے پھر سوال کیا۔ لہجے سے تجسس سا نمایاں تھا۔

"دریا کی لہروں میں۔" لڑکی نے بتایا۔

"کیا آپ واقعی سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی ہیں۔"

"میرے حالات میں غیر سنجیدہ لمحہ تو کبھی آیا ہی نہیں اور آپ نے گزشتہ شب خود ہی اس بات کا مشاہدہ کر لیا ہوگا۔ میری حالت پر کوئی ترس کھانے والا ہے نہ مجھے پناہ دینے والا بلکہ میری ذات سب کے لیے مشکوک ہی ثابت ہوتی ہے لہٰذا جہاں بھی پناہ لینے کی کوشش کروں گی وہاں مجھے ایسی ہی نفرت اور حقارت سے نوازا جائے گا۔ چنانچہ اب موت کو گلے لگانے کے سوا میرے لیے کوئی کار ہی نہیں ہے۔" لڑکی کی آواز میں دکھ تو جھلک رہا تھا لیکن اس کا لہجہ پرعزم تھا۔ یعنی اب فواد کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ ان کا ہمدردی سے لبریز دل اس حالات کا شکار لڑکی کے لیے پگھلا جا رہا تھا۔ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ کس طرح اسے اس کے انتہائی اقدام سے باز رکھیں۔

اس سے کہیں کہ نہیں نہیں تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو میں تمہیں پورا پورا تحفظ دوں گا مگر کیسے کہتے بھلا جب کہ خود ہی بالکل تہی دست اور بے بس تھے۔ ویسے بھی ان کی زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا کسی لڑکی سے اس قدر قریب اور

ہمکلام ہونے کا وہ بھی بھلا کن حالات میں ایسی باتوں کو نمٹانے کی ان میں نہ سوجھ بوجھ تھی نہ کوئی تجربہ ہی...... وہ کچھ دیر تو سوچتے فرہے پھر اپنا سر کھجاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''شاید آپ کو یاد ہوگا کل رات کو آپ نے کہا تھا کہ...... کہ احسان کا کوئی ہوتا تو آپ...... آپ...... ہاں کچھ ایسا ہی کہا تھا آپ نے۔'' انہوں نے اپنی بات بہت ڈرتے جھجکتے کہی۔

''تو کیا آپ اپنے احسان کا بدلہ چاہتے ہیں۔'' لڑکی نے چبھتے سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں' صرف ایک اسی بات کی وساطت سے خود کو یہ کہنے کا مستحق سمجھتا ہوں کہ آپ۔''

''ہاں ہاں کہتے کہتے ہیں حتیٰ المقدور آپ کے ہر مطالبے کو پورا کرنے کی کوشش کروں گی۔'' لڑکی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''کیا یہ آپ کا وعدہ ہے۔'' انہوں نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں بالکل سچا اور پکا۔''

''تو پھر اس بات کو حقیقت میں بدل دیں جو میں نے محض بہانا بنانے کے طور پر کل رات کو بھائی اور بھابی جان کے سامنے کہی تھی۔''

''جی۔'' وہ مارے حیرت کے اچھل پڑی اور ان کی طرف گھوم کر بولی اس کی آنکھوں میں بڑی کاٹ تھی اور چہرے پر جذب کی سرخی اتنا خوب صورت انداز کہ وہ دل تھام کر رہ گئے اور جلدی سے نگاہیں چرا کر بولے۔

''میں نے حد ادب سے بڑھ کر کوئی بات تو نہیں کی البتہ چھوٹا منہ بڑی بات ضرور ہے لیکن انوکھی بات نہیں ہے۔''

''انوکھی بات تو نہیں ہے مگر...... مگر...... یہ کیسی طرح بھی ممکن ہے۔'' لڑکی نے تھوڑے توقف سے نگاہیں جھکا کر کہا۔

''کیوں' کیوں ممکن نہیں آخر دیکھتے آپ کو تحفظ چاہیے تو وہ اپنی جان پر کھیل کر آپ کو دوں گا۔ ہاں البتہ میں بالکل تہی دست اور قلاش ہوں...... مالی طور پر میں آپ کی مدد بالکل نہ کر سکوں گا مگر یہ بھی اسی وقت تک جب میں کچھ بن نہیں جاؤں گا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ کو اس بات پر انکار ہے نا۔'' وہ پھر اپنی فطری سادگی سے بات کرنے لگے۔

''نہیں' بلکہ میں یہ نہیں چاہتی کہ کل کلاں کو آپ کو یہ احساس ہو کہ میں تو سچ مچ ہی آپ کے گلے پڑ گئی جب کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب میں نے آپ سے مدد کی درخواست کی تھی اور آپ مجھے کالج لے جا رہے تھے تو آپ کے دل میں یہ خیال ضرور آیا ہوگا۔''

''لیکن......لیکن......وہ تو ایک قدرتی بات تھی......مگر اس وقت تو میں اپنی مرضی اور خوشی سے کہہ رہا ہوں آپ کی زبردستی سے تو نہیں۔'' انہوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے......لیکن آپ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ میں کون ہوں......کیا ہوں......اور مجھ پر ایسی کیا بیتی ہے جو اس وقت یہاں کھڑی نظر آ رہی ہوں۔'' لڑکی نے ان کی نگاہوں کی زد میں آتے ہوئے چہرے کو جھکا کر کہا۔

''مجھے ایسی باتوں کو جاننے کی پرواہ ہے نہ تمنا۔ بس میرے دل نے آپ کی رفاقت کو منظور کر لینے پر مجھے اکسایا اور میں نے درخواست گزاری کر دی۔'' وہ بے پرواہی کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

''دل کے فیصلے کبھی کبھی بڑے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں فواد صاحب آپ کو جب معلوم ہوگا کہ میں کون تو آپ۔''

''مجھے کچھ بھی معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہو......محترمہ۔''

''مجھے زریں گل کہتے ہیں۔'' اوہ نام تو بہت ہی خوب صورت ہے انہوں نے دل میں اس کے نام کو سراہا اور بولے۔

''ہاں تو زریں گل صاحبہ ہیرے کی پہچان اس کی تراش خراش سے ہوتی ہے سادہ پتھر سے نہیں اور میری نگاہوں نے آپ کے اندر چھپی صلاحیتوں کو پہچان لیا ہے۔ آپ مجھ پر بھروسہ کریں زریں گل۔''

مگر زریں گل نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں۔

''میں صرف درخواست ہی کر سکتا ہوں زریں گل اصرار نہیں۔'' اسے خاموش دیکھ کر وہ ملتجی سے انداز میں بولے۔ دل میں اچانک ہی اس کی محبت کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

''عجلت میں کیے فیصلے عموماً منفی نتائج کے حامل ہوتے ہیں فواد صاحب اور مشکل تو یہ ہے کہ آپ کے سوچنے اور غور کرنے کا بھی وقت نہیں ہے۔'' وہ ان کی قربت سے بچنے کے لیے تیزی سے گھوم کر پلنگ کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

''جب وقت پر دسترس نہ ہو تو سوچنا سمجھنا بیکار ہوتا ہے زریں گل آپ صاف صاف یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ آپ کو مجھ جیسے بے مایہ اور ادھورے سے انسان کی رفاقت بالکل منظور نہیں۔ یقین مانیں میں بالکل برا نہ مانوں گا کیونکہ زبردستی اور جبر کا میں بالکل قائل نہیں ہوں۔ اصل میں تو یہ رشتے دلوں کی ہم آہنگی اور آمادگی پر ہی استوار ہوتے ہیں کسی کو مجبور کر کے نہیں۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر دروازے کے آگے ہی ٹہلتے ہوئے بولے اور لڑکی پلنگ کی طرف رخ کیے انگلی میں پڑی قیمتی انگوٹھی کو تکتی رہی۔

''ٹھیک ہے تو پھر آیئے چلتے ہیں بس میں ذرا اپنی چند ضروری چیزیں اور لے لوں۔'' اپنی بات کہہ کر وہ پلنگ کے

نزدیک آئے تو وہ تھوڑا سا ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے پلنگ کے نیچے سے ایک پرانا سا بکس گھسیٹا جس میں ان کے کپڑے رکھے تھے' اسی میں انہوں نے جلد جلد اپنی کتابیں بھریں' شیو کا سامان رکھا اور پھر تکیے پر پڑا تولیہ اٹھا کر اپنے سلیپر اور جوتے اسی میں باندھے اور پھر اس سے فارغ ہو کر انہوں نے زریں گل سے کہا۔

''آیئے چلیے۔'' لیکن زریں گل نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔

''میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا اور پھر ان کا جواب سنے بغیر شروع ہوگئی۔

''میں ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے خاندان کی لڑکی ہوں اور اپنے والدین کی اکلوتی والدہ کا انتقال میری صغیر سنی میں ہی ہوگیا تھا' والد نے کچھ دن تو میری ناز برداریوں میں گزارے پھر عمر اور نفس کے تقاضے سے مجبور ہو کر دوسری شادی کرلی۔ سوتیلی والدہ نے حسب عادت مجھ سے وہی سلوک کیا جو عام طور پر سوتیلی ماں اپنی سوتیلی اولاد سے روا رکھتی ہے لیکن والد کا رویہ پھر بھی بہتر تھا انہوں نے ہی ماں کی مخالفت کے باوجود مجھے پڑھوایا لکھوایا تھا اور ابھی میں نے میٹرک پاس ہی کیا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا اور یوں مجھ پر ظلم و تشدد کے باب نکل گئے۔ ماں نے صرف سختیاں ہی نہیں کیں بلکہ مجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے ہمارے ہی قبیلے کے ایک شخص کے ہاتھ بیچ دیا۔ پھر وہ شخص راتوں رات مجھے یہاں لے آیا اور دو ماہ تک ایک نائکہ کی نگرانی میں مجھے اس گھر میں رکھا اور آج صبح اس نے ایک سیٹھ ساہوکار کے ہاتھ مجھے بیس ہزار روپے میں فروخت کردیا تھا۔ یہ سودا اسی قسم کا تھا جو ایک جوان اور نا کتخدا طوائف کی نتھنی اتارنے کی رسم کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔'' زریں گل اپنی بپتا سنا کر خاموش ہوئی تو فواد نے کہا۔

''لیکن یہ تو کوئی ایسی قابل گرفت بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے آپ کو مجبور اور بے بس دیکھ کر آپ کا سودا کیا گیا تھا اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ قدرت نے مجھے آپ کا مددگار بنا کر عین موقع پر بھیج دیا یا پھر مجھے آپ جیسی ہیرا صفت خاتون نے نواز دیا۔'' وہ اپنی بات کہتے کہتے اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئے۔ ''آپ ان خدشات اور وسوسوں کو فوراً اپنے دل سے نکال دیں۔ فواد کو آپ ہر حالت اور ہر صورت میں پسند ہیں۔'' انہوں نے آہستہ سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کیا ایک ایسی لڑکی جس کی قیمت لگ چکی ہو...... جو بکاؤ مال کی طرح ہو۔'' وہ اشکوں سے بوجھل آواز میں بولی۔

''ہاں ایسی ہی لڑکی کیوں کیا آپ کو محبت کا یہ سودا منظور ہے جو فواد آپ سے کررہا ہے۔'' انہوں نے پیار سے اس کے شانوں پر دباؤ ڈال کر پوچھا۔ اف پہلی بار ایک مرد نے پیار کا رس کانوں میں گھولا تھا۔ وہ کتنا کھرا' سچا اور سادہ لوح تھا اس کا اندازہ زریں کو اس کی سیدھی سادگی گفتگو اور کردار کے ٹھوس پن سے ہی ہوگیا تھا اور پھر وہ تو بہت پہلے ہی اس

کے من میں بس چکا تھا مارے خوشی کے زریں کی آنکھوں میں بدلیاں سی اتر آئیں جنہیں پی کر اس نے دھیرے سے کہا۔

"جی منظور ہے۔ دل و جان سے منظور ہے۔" اور اقرار کے اس محبوب سے انداز پر وہ خوشی سے دیوانے ہوا ٹھے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا اور سینے سے لگانا ہی چاہتے تھے کہ وہ ان کے ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"ابھی آپ مذہبی اور قانونی حیثیت سے اتنی بے ساختگی کے مستحق نہیں ہیں۔" لہجے میں نسوانی حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور ہلکی سی فہمائش بھی تھی۔

"اوہ ہاں ہاں سوری...... دراصل خوشی کی بے پایاں کیفیت میں مجھے اس نزاکت کا احساس نہیں رہا تھا۔" وہ خجل سے ہو کر بولے...... اور تبھی قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو انہوں نے دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اے رب رحیم میں تیری نوازشوں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ تو نے میری زندگی کو آج ایک خوب صورت موڑ سے نوازا ہے۔ تو مجھے اس نئی راہ پر ثابت قدمی سے چلنے کی توفیق عطا فرما۔" اور پھر انہوں نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرنے کے بعد زریں سے کہا۔

"آیئے اب چلتے ہیں۔ آج کے دن کا آغاز ہم اپنے اس اٹوٹ رشتے کو مستحکم کر کے ہی کریں گے۔" اور تب زریں گل نے وہ پوٹلی جو اس کے بقول اس کی کل متاع تھی ان کے قدموں میں ڈال دی۔

"آج کے مبارک دن کی خوشی میں یہ حقیر سا نذرانہ ہے ملک فواد۔" اس نے عقیدت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ تو وہ پوٹلی کے پاس سے یوں ہٹے جیسے وہ پوٹلی نہیں سانپ کی پٹاری ہو۔

"اسے...... اسے اٹھا لیجیے زریں گل اور آئندہ کبھی اسے اپنے اور میرے درمیان نہ لائیے گا کیونکہ یہ محبت ہی ثابت ہوگی ویسے بھی مجھے اپنے زور بازو پر بھروسہ ہے۔ میں محنت کروں گا' مزدوری کروں گا حتی کہ اینٹیں تک اٹھاؤں گا۔ لیکن آپ کو کبھی بھوکا نہیں رکھوں گا۔" انہوں نے بڑے پرعزم لہجے میں کہا تو زریں گل نے جھک کر وہ پوٹلی اٹھائی پھر دونوں باہر نکل آئے۔ مگر برآمدے میں آتے ہی جواد صاحب کو وہاں ٹہلتا دیکھ کر دونوں کی جان ہی نکل گئی۔

"کہاں جا رہے ہو۔" انہوں نے کڑک کر پوچھا۔

"جہاں قسمت لے جائے گی بھائی جان۔" وہ بھائی کو سلام کرنے کے بعد بولے۔

"ہونہہ قسمت لے جائے گی۔ قسمت کے رحم و کرم پر خود کو چھوڑ دینے والے ہمیشہ ناکام ہی رہتے ہیں۔ قسمت تدبیر اور محنت سے بنتی ہے ملک فواد اور تیرے پاس تو نہ گھر ہے نہ در ہے اور نہ پیسہ چلا ہے قسمت کے سہارے بیوی کو لے کر۔ کیا اسے فٹ پاتھ پر سلائے گا۔" انہوں نے لتاڑنے کے سے انداز میں کہا۔

''نہیں بھائی جان میں قدرت کی کرشمہ سازی کا قائل ہوں۔ جب وہ کسی کو بھوکا نہیں رکھتی تو بے گھر اور بے در بھی نہ رکھتی ہوگی۔'' وہ بری بے فکری کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

''اوہو کیسی کترنی کی طرح زبان چل رہی ہے۔ چل رکھ یہ بکنا۔'' انہوں نے پیار سے جھڑک کر کہا اور پھر ملازمہ کو جو صحن سے باورچی خانے کی طرف جارہی تھی آواز دی۔

''اوے فیضان۔''

''جی میاں جی۔'' فیضان نے چلتے چلتے رک کر وہیں سے جواب دیا۔

''وہ باری والا کمرہ ہے نا اس میں نواڑی پلنگ بچھوا دے۔'' یہ دونوں اب اسی کمرے میں رہا کریں گے۔'' اور فیضان جس کا منہ فواد کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر کھلا کا کھلا رہ گیا تھا ڈھیلے سے لہجے میں بولی۔

''اچھا جی۔''

''ہاں اور اپنی مالکانی سے بھی کہہ دینا کہ میں نے وہ کمرہ ان دونوں کو دے دیا ہے۔ یہ تیرا چھوٹا ملک اپنی بیوی کو گھر لایا ہے اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔'' انہوں نے گویا یہ کہہ کر ملازمہ کا تجسس دور کر دیا اور فیضان اپنے سارے کام چھوڑ کر ان کا کام کرنے چل دی۔

''چلو جاؤ تم دونوں اپنے اس کمرے میں۔'' جواد صاحب نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا اور پھر فوراً ہی اندر چلے گئے۔

''کہیے اب تو آپ نے مان لیا ہوگا قدرت کی کرشمہ سازی کو۔'' بھائی کے جاتے ہی انہوں نے زریں گل سے کہا۔

''جی ہاں لیکن میں آج سے نہیں ہمیشہ ہی سے جانتی ہوں۔''

☆☆☆

ملک جواد نے اپنے طور پر تو بھائی کے ساتھ بڑی رعایت برتی تھی کہ انہیں اپنے گھر کا ایک معقول کمرہ رہائش کے لیے دے دیا تھا۔ گھر میں جو کچھ بھی پکتا وہ اس میں چھوٹے بھائی اور بھاوج کو بھی شریک کر لیتے۔ مگر ناصرہ بیگم کو میاں کی یہ نرمی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ جھوٹی سچی باتیں میاں کے کانوں میں ڈال کر انہیں ورغلاتی اور بھڑکاتی ہی رہتی تھیں۔ حالانکہ گھر میں دو ملازمائیں اور ایک ملازم بھی تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ سارا کھانا زریں گل سے ہی پکواتی تھیں اور ایک ذراسی چوک پر لاکھوں فضیحتے، لعن طعن، کوسنے اور گالیاں مگر اس کے حالات ہی ایسے تھے کہ وہ یہ سارے جور و ستم چپ چاپ سہہ لیتی حتیٰ کہ فواد کو بھی نہ بتاتی کہ فواد ان دنوں اپنے حالات سے جہاد کر رہے تھے۔ وہ پڑھ بھی رہے تھے ٹیوشنز

بھی پڑھا رہے تھے اور بلدیاتی ادارے میں مزدوری بھی کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ اپنا اور اپنی شریک حیات کا بار بھائی کے کاندھوں پر ڈالنا نہیں چاہتے تھے اس لیے اپنے حصے کا راشن بھی ہر ماہ لا کر ڈلواتے تھے۔ اس کے باوجود بھی ناصرہ بیگم کی تیوری کا بل سیدھا نہ ہوتا تھا۔ ان کے لیے تو ان کا دیور کا وجود شروع ہی سے ناقابل برداشت تھا اور ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا پھر بھلا وہ دیور کے ساتھ اس کی بیوی کے وجود کو کیسے برداشت کر لیتیں۔

ملک جواد کے والد جالندھر کے رہنے والے تھے۔ ان کا وہاں ایک چھوٹا سا زمیندار تھا اور تھوڑی سی جائیداد بھی۔ بڑے دیندار اور خدا ترس انسان تھے۔ اس لیے تقریباً سب ہی ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کی پانچ اولادیں تھیں سب سے بڑی ملک جواد۔ ان سے چھوٹی دو لڑکیاں' طاہرہ اور عابدہ' پھر ایک لڑکا شہزاد اور سب سے چھوٹا فواد ملک اللہ یار کا گھرانا خاصا کھاتا پیتا اور خوشحال تھا۔ لڑکے تعلیم پا رہے تھے اور لڑکیاں امور خانہ داری نبھا رہی تھیں۔ کیونکہ ملک اللہ یار کی بیوی کا فواد کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی انتقال ہو گیا تھا۔ پھر جب ملک جواد نے مقامی ہائی اسکول سے میٹرک پاس کر لیا تو بڑے ملک نے انہیں زمینوں کی دیکھ بھال کے کام پر لگا دیا۔ لڑکیاں بھی اس عرصے میں جوان ہو چکی تھیں اور طاہرہ کی برادری میں ایک جگہ نسبت ٹھہر گئی تھی۔ البتہ عابدہ بھی چھوٹی تھی یہی کوئی دس گیارہ سال کی وہ اور شہزاد جڑواں تھے اور فواد کی عمر صرف سات آٹھ سال کی تھی کہ ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ سیاسی پارٹیوں اور برٹش سامراج کے درمیان طے تو یہی پایا تھا کہ جالندھر پاکستان کے حصے میں جائے گا۔ مگر یہ بھی انگریزی شاطر حکمرانوں اور کانگریس کی ایک چال تھی جس کا بھانڈا اس وقت پھوٹا جب ملک تقسیم ہو گیا اور جالندھر کو پاکستان سے کاٹ کر بھارت کے قبضے میں دے دیا گیا۔ پھر تو وہ خون خرابا ہوا کہ خدا کی پناہ' ہندو اور سکھ جو کہ پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے جالندھر بے گناہ اور بے ضرر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ ملک اللہ یار بھی بری طرح ان فسادات کی لپیٹ میں آ گئے۔ ان کی ساری املاک لوٹ لی گئی حتیٰ کہ ہندو اور سکھ درندوں نے ان کے ناموس کی بھی دھجیاں اڑا دیں۔ شہزاد بھی بہنوں کو بچانے کی کوشش میں شہید ہو گیا۔ اور ملک اللہ یار کسی نہ کسی طرح اپنی اور اپنے دونوں بیٹوں جواد اور فواد کی جان بچا کر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو کر پاکستان پہنچ گئے۔ جو کچھ سمیٹا جا سکا تھا وہ ایک گٹھڑی میں باندھ لائے تھے اس سے پرچون کا ایک چھوٹا سا کھوکھا کھول لیا تھا اور بس اسی پر گزر بسر ہو رہی تھی ادھر جواد بھی ایک عرصے تک سرگرداں رہے تھے۔ پھر ایک روز ان کی قسمت نے یاوری کی کہ حکومت کی طرف سے کلیم کا متبادل حکم نامہ جاری ہو گیا اور انہوں نے بھی بھاگ دوڑ کر کے کسی نہ کسی طرح اپنا کلیم حاصل کر لیا اور یوں قدرے آسودہ حالی سے گزر بسر ہونے لگی۔ ملک جواد نے لاہور پہنچتے ہی فواد کو ایک گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیا تھا اور وہ چوتھی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ بہت ذہین اور ہونہار

تھا۔اس لیے اپنے ضائع شدہ سالوں کی کمی محنت کر کر کے پوری کر لی تھی۔باپ تو جالندھر چھوڑنے کے بعد ہی ہر چیز سے بری الذمہ ہو گئے تھے۔اکٹھی تین تین جوان اولادوں کی مفارقت کا غم اتنا بڑا سانحہ تھا کہ ان کا دماغ بھی تھوڑا تھوڑا بہک گیا تھا۔ہر دم خاموش، کھوئے کھوئے اور گم صم سے رہتے تھے۔پھر بھی جانے کیونکر ساتھ آٹھ سال کھینچ گئے۔ان کے انتقال کے بعد جواد جن کے کاندھوں پر شروع سے ہی باپ نے یا حالت نے فواد کی ذمہ داری ڈال دی تھی کلیتہ اس کے سرپرست اور کفیل بن گئے تھے۔ان کی شادی باپ کی زندگی میں ہی نارہ بیگم سے ہو گئی تھی۔

ناصرہ بیگم بھی پٹیالہ کے ایک غریب مہاجر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور بالکل پڑوس کے مکان میں رہتی تھیں۔ ان کے والدین بھی کثیر اولاد تھے۔پانچ بہنیں اور تین بھائی مگر غربت کی وجہ سے تینوں بھائی ناکارہ اور نکمے تھے۔دو بڑی بہنوں شادیاں ہو چکی تھیں۔ناصرہ بیگم حسین و جمیل نہ سہی خوش شکل ضرور تھیں اور سب سے بڑھ کر سخت چلتر اور چالاک...... ماں نے دیکھا کہ پڑوس میں ایک جوان شریف اور آسودہ حال لڑکا رہتا ہے گھر میں کوئی عورت بھی نہیں ہے تو بیٹی کو اکسایا کہ اس پر ڈورے ڈالے جبکہ لڑکا سخت نروٹا اور خشک مزاج تھا اور کسی حد تک غمزدہ بھی۔وہ ہر دم فکر روزگار میں ہی جتا نظر آتا تھا مگر تھا تو چڑھتی جوانی کے دور میں۔ادھر دورے بھی کچھ اس قدر ڈرامائی انداز میں ڈالے گئے تھے وہ جلد ہی ناصرہ بیگم اور ان کی ماں کے دام میں آ گیا اور پھر وہی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات ہوئی۔کیونکہ ملک الہ یار تو ہمیشہ سے حلیم اور خدا ترس تھے۔اس پر تقریباً ہر بات سے ہی بری الذمہ ہو گئے تھے۔بیٹے نے ڈرتے ڈرتے بہت مودبانہ شادی کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے فوراً ہی اجازت دے دی۔مگر ناصرہ بیگم کی نظروں میں سسر اور دیور کا وجود سخت کھٹکتا تھا اور وہ دل سے سسر کی موت کی تمنائی تھی۔شوہر کو شروع ہی سے ایسا قبضے میں کیا تھا کہ وہ بیوی کی کسی بات پر نہ نہیں کرتے تھے۔

بہر حال شادی کے دو سال بعد ان کی دلی تمنا بر آئی اور سسر کا کانٹا ان کی راہ سے خود بخود صاف ہو گیا اور پھر تو ان کی بن ہی آئی۔انہوں نے فواد پر ستم توڑنے شروع کر دیے۔اسی سے گھر کے سارے کام کراتیں اور ہر وقت اسے گالیوں کو سنوں اور جوتیوں سے نوازتی رہتیں۔انہوں نے بہت چاہا کہ پڑھائی چھوڑ دیں۔لیکن جواد صاحب نے اس معاملے میں ان کی ایک نہ چلنے دی وہ اس لیے کہ ان کے والد نے مرتے وقت انہیں وصیت کی تھی کہ فواد کا خیال رکھنا اسے خوب تعلیم دلوانا اور اس کے بالغ ہونے کے بعد اس کا حصہ اسے ضرور دے دینا تو جواد صاحب فواد کے لیے بیوی کی وجہ سے اور کچھ تو نہیں کر سکے تھے البتہ اسے تعلیم ضرور دلواتے رہے تھے۔ورنہ خود انہوں نے بھی بیوی کی باتوں میں آ کر بھائی کی گت کچھ ہی اور کر رکھی تھی۔فواد کو ہر معاملے میں اتنی محرومیاں ملی تھی اتنی زیادہ کہ اگر ان کی جگہ کوئی اور لڑکا ہوتا تو یقیناً بگڑ

ہی جاتا مگر وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنی محرومیوں کا انتقام دوسروں سے اور اپنی ذات سے لیتے ہیں اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو تباہی ڈال دیتے ہیں بلکہ وہ تو فطرتاً بہت مسکین اور خاموش طبع تھے اور تقدیر کا لکھا سمجھ کر اپنے انہیں حالات پر صبر و شکر کر لیتے تھے۔

ناصرہ بیگم نے ان کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کر لیے تھے۔ کئی کئی وقت تک بھوکا رکھنا۔ ایذائیں دینا۔ ان کی بساط سے بڑھ کر کام لینا۔ مارنا پیٹنا' کونسا کانٹا تھے کہ تعویذ گنڈے اور سفلی عمل بھی کر کے دیکھ لیا تھا۔ اور اسی پر ہی بس نہیں چلا تھا تو ایک دفعہ اپنے بھائی کو سکھا پڑھا کر برستی بارش میں فواد کو اس کے ساتھ اوپر چھت پر پانی کی ٹنکی کا ڈھکنا بند کرانے کے بہانے بھیجا تو ان کے بھائی نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فواد کو ٹنکی میں دھکا دے دیا۔ ٹنکی آدھی سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ ایک دم ہی وہ پانی میں گری تو ان کے پیر بھی ٹنکی کی تہہ پر نہ جم سکے۔ مگر انہوں نے تیزی سے پانی سے ابھر کر کہ سانس گھٹ رہا تھا ٹنکی کے کنارے لگے ہوئے نلکے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیا اور اسی کا سہارا لے کر دوسرے ہاتھ سے ٹنکی کا کنارہ پکڑ کر جونہی اوپر آنا چاہا۔ ناصرہ بیگم کے بھائی نے جو ٹنکی پر جھکا ہنسے جا رہا تھا ان کے سر پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر انہیں پانی میں ڈبو دیا پھر یہی ہوتا رہا کہ جونہی وہ پانی سے سر نکال کر اوپر آنا چاہتے' ناصرہ بیگم کا بھائی ان کے سر کو دبا کر انہیں پانی میں ڈبو دیتا۔ یہ سلسلہ تقریباً آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔ بار بار پانی میں ڈبکیاں کھانے کی وجہ سے فواد کی ناک کان اور آنکھیں درد سے پھٹنے سی لگیں۔ سارا جسم دکھنے لگا اور چہرہ تانبے کی طرح تپنے لگا۔ یہ تنگ آ کر رونے لگی تو چونکہ ان کی زندگی باقی تھی اس لیے ناصرہ بیگم کے بھائی کو ان پر ترس آ گیا۔ وہ ہنس کر بولا۔

"یار تو تو بڑا سخت جان ہے قسم سے تیری جگہ اگر میں ہوتا تو کب کا گزر چکا ہوتا۔ چل نکل باہر۔" اور تب آنکھوں میں آنسو بھرے فواد اس کے ہاتھ کو پکڑ ٹنکی سے باہر نکل آئے اور بھاگتے ہوئے اپنی اسی کوٹھڑی میں آ گئے ان دنوں ویسے بھی موسم خراب تھا اور گھر گھر بخار اور زکام وغیرہ پھیلا ہوا تھا۔ اتنی دیر تک پانی میں رہنے کی وجہ سے گیلے کپڑے اتارتے اتارتے انہیں بخار چڑھ گیا اور پھر وہ کئی روز تک بے سدھ پڑے رہے۔ مگر کسی نے بھی پلٹ کر انہیں نہیں پوچھا سوائے رکھی کے۔ رکھی جس کا باپ دادا۔ اسی خاندان کا پروردہ تھا اور جو خود بھی اسی گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور پروان چڑھی تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد اس کی شادی اسی کی برادری کے ایک شخص سے کر دی گئی تھی مگر اس کا شوہر چند سال ہی زندہ رہا تھا اور بیوی ہونے کے بعد رکھی اپنی اکلوتی شیر خوار بچی جیراں کو لے کر پھر اپنے آقا ملک اللہ یار کے یہاں آ گئی تھی اور وہی ایک واحد ہستی تھی جو فواد کا خیال رکھتی تھی۔ اپنی بدمزاجی اور ملازموں سے ناروا سلوک کی وجہ سے

ناصرہ بیگم رکھی کو بالکل نہیں بھاتی تھی۔ وہ نمک حلال ہی نہیں ملکوں کے خاندان پر جاں نثار کر دینے والی ہستی تھی اور اپنے آقاؤں کا دکھ درد اپنے سینے میں محسوس کرتی تھی۔ وہ ناصرہ بیگم سے اس لیے بھی خار کھاتی تھی کہ ناصرہ بیگم اس کے آقاؤں کا پیسہ اپنے میکے والوں پر جو پڑوس میں رہتے تھے لٹاتی تھیں۔ بہر حال فواد کی تھوڑی بہت تیمارداری کرتی رہی کیونکہ ملکانی کے عتاب کے ڈر سے کھل کر وہ بھی فواد کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی اور جیسا کہ فواد نے تہیہ کیا تھا کہ ناصرہ بیگم کے بھائی کی شکایت اپنے بھائی سے ضرور کریں گے تو گھر والوں کی اس قدر بے حسی اور بے پروائی دیکھ کر انہوں نے بھائی سے کچھ بھی کہنا مناسب نہ سمجھا بلکہ الٹا بھاوج کے کوسنے اور برا بھلا ہی سنا۔

خیر ان دنوں تو وہ کل تیری چودہ برس کے تھے اور اتنے سیدھے اور بیوقوف کہ ہر کسی کی باتوں میں آ جاتے تھے اور ایک رکھی ہی تھی جو انہیں اونچ نیچ سمجھایا کرتی تھی۔ جبکہ زندگی وقت حالات اور زندگی کے تلخ تجربات خود ہی بے وقوف سے بے وقوف انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔

ناصرہ بیگم کی شادی کو سات سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور اس عرصے میں ان کے دو کچے بچے ضائع ہو چکے تھے اور اب وہ پھر امید سے تھیں اور جواد صاحب چاہتے تھے پہلوٹھی کی ہی نہیں ان کی تمام اولادیں ہی نرینہ ہوں۔ یوں تو ویسے بھی پست ذہنیت اور کج فہم لوگ نرینہ اولاد کے متمنی ہوتے ہیں۔ اگر پہلوٹھی کی اولاد لڑکی ہو تو ان کی گردنیں شرم سے جھک جاتیں ان کی ساری خوشیوں پر پانی پھر جاتا ہے اور بعض عقل کے پورے اپنی بیویوں کو طعن طعن اور عتاب کا نشانہ بناتے ہیں کہ اس نے پہلی اولاد لڑکی کیوں پیدا کی۔ جبکہ ارشاد خداوندی ہے کہ جس عورت کے یہاں پہلی اولاد لڑکی ہوتی ہے وہ نہ صرف بھاگوان ہوتی ہے بلکہ خدا کے یہاں اس کا درجہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جواد کا مسئلہ کچھ نفسیاتی سا تھا۔ چونکہ وہ اپنی دونوں جوان بہنوں کا المناک انجام دیکھ چکے تھے اس لیے لڑکی کے تصور سے ہی دور بھاگتے تھے ان کا کہنا تھا کہ لڑکی تو چوراہے پر رکھا خزانہ ہوتی ہے جس کی حفاظت کرنا مشکل نہیں ناممکن ہی ہوتا ہے اور پھر حسن اتفاق سے ان کی بیوی نے ایک لڑکی کو ہی خنجر اور اس وجہ سے ان کی نظروں میں بیوی کی قدر و منزلت اور اہمیت بہت بڑھ گئی۔ تیمور کی ولادت کے بعد تو وہ سیاہ کرتیں یا سفید انہیں کسی بات سے کوئی غرض ہی نہ ہوتی تھی اور چھوٹے بھائی کی طرف سے تو وہ ایسے بے غرض اور لاپرواہ ہو گئے تھے کہ جیسے اس کا گھر میں کوئی وجود ہی نہ ہو اور یوں ناصرہ بیگم کی بن آئی تھی۔ انہوں نے خود ہی اپنی مصلحتوں کے تحت اپنی بڑی بہن زبیدہ کے لیے جو فواد سے چند سال بڑی ہی تھی اور اپنی غریبی اور معمولی شکل و صورت کی وجہ سے اب تک کنواری ہی بیٹھی تھی زبان دے دی تھی۔ وہ فواد سے اس کی شادی کریں گی بس ذرا وہ اپنی تعلیم مکمل کرے۔ جبکہ میٹرک کے بعد خود انہوں نے ہی فواد کے کالج میں داخلہ لینے کی سخت مخالفت کی تھی بھائی بھی بیوی کی زبان

بولتے تھے اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ان کی مزید تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے اور تب فواد نے خود ہی اپنے لیے ایک دو ٹیوشنیں ڈھونڈ کر کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور اب اس طرح محنت کر کر کے پڑھتے پڑھتے بی اے فائنل میں آئے تھے تو اچانک اتنے خفیہ طور پر شادی رچا بیٹھے تھے۔ اور اس پر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ جواد صاحب نے بھائی بھاوج کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت بھی دے دی۔ حالانکہ ناصرہ بیگم نے واویلا تو بہت مچایا مگر جواد صاحب نے ان کی اس بات کا بالکل نوٹس نہیں لیا۔ تو اب ان کا سارا نزلہ بے چاری زریں گل پر ہی گرا۔ ہر وقت کی وردور۔ پھٹ پھٹ' گالیاں کوسنے' لعن طعن۔ کھانا پکانا اور بچوں کو سنبھالنا اور بات بے بات کے فضیحتے سننا گویا زریں گل کا مقدر بن کر رہ گیا۔ مگر وہ انتہائی زیرک اور معاملہ فہم لڑکی تھی کبھی جواب دینا تو کجا فواد کے سامنے بھی حرف شکایت زبان پر نہ لائی تھی۔ لیکن خود فواد کو سب کچھ معلوم تھا کہ ان کے ساتھ وہ کس قدر ذلت اور خواری کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ کتنی کلفتیں اٹھا رہی ہے۔ شادی کے بعد فواد نے تلاش بسیار کے بعد دو ٹیوشنز اور حاصل کر لی تھیں اور پھر کالج کے اوقات کے بعد وہ ایک بلدیاتی ادارے میں مزدوروں کی تنخواہ بانٹنے کا کام بھی کرتے تھے جس کا معاوضہ بہت قلیل تھا مگر نہ سے ہاں ضرور ہو جاتی تھی۔ اس لیے بہت ہی غنیمت تھا اور بھائی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے۔ اس لیے مہینے میں دو تین مرتبہ پیسے جمع کر کے اپنے حصے کا راشن بھی ڈلوا دیا کرتے تھے مگر ناصرہ بیگم کی تیوری کا بل پھر بھی سیدھا نہ ہوتا تھا۔

فواد کی حیثیت گھر میں خواہ کیسی بھی تھی لیکن عزیز رشتے داروں اور برادری میں وہ ملک اللہ یار کے چھوٹے بیٹے ہی مانے جاتے تھے اس لیے ذات برادری میں ان کی بیوی کی اہمیت بھی وہی تھی جو ناصرہ بیگم کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ زریں گل کی خوب صورتی اور خوش اخلاقی کے چرچے بھی تقریباً سب ہی ان کے ساتھ ناصرہ بیگم کے ناروا سلوک سے واقف تھے۔ جو ذات برادری والا آتا ناصرہ بیگم کو نظر انداز کر کے زریں گل کی طرف ہی جھکتا۔ جبکہ ناصرہ بیگم زریں گل کے خلاف سب کے کانوں میں زہر ہی اگلتی رہتیں اس کے باوجود بھی رشتے داروں کو انہیں اتنی اہمیت دیتا دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور خصوصاً اس وقت جب رشتے دار زریں گل کو بہت اصرار سے اپنے یہاں آنے کو کہتے۔ مگر زریں گل کم ہی کہیں جاتی تھیں کیونکہ ان کے پاس معقول لباس نہیں ہوتا تھا۔ چاہتیں تو اپنے پیسے سے بہت کچھ بنا سکتی تھیں مگر اپنا پیسہ خرچ کرنے میں شوہر کی انا کا سوال اڑے آ جاتا تھا۔ اس لیے شوہر کے ہی بنائے ہوئے جھوٹے دو تین جوڑوں میں گزر بسر کرتی آ رہی تھیں۔

پھر ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ملک فواد کی سگے پھوپھی زاد بھائی تھی جو چند ماہ پیشتر ہی سیالکوٹ سے ٹرانسفر ہو کر لاہور آئے تھے۔ اپنے بیٹے کے عقیقے کی تقریب میں ملک برادران کو مدعو کیا تو بہت اصرار سے زریں گل کو اس تقریب

میں آنے کے لیے آمادہ نہ ہوئیں جیٹھانی کے ساتھ جہاں بھی جاتی تھیں جیٹھانی کے ہاتھوں نہیں خوار ہی ہونا پڑتا تھا۔
لیکن فواد اپنے پھوپھی زاد کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے وہ زریں گل کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے اور یہ زریں گل کی بدقسمتی ہی تھی کہ دعوت میں موجود ایک عورت نے زریں گل کو پہچان لیا اور جب سے اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ فواد کی بیوی ہے تو اس ناصرہ بیگم سے کہا۔

''اسے یہی موئی چکلے پر بیٹھنے والی رہ گئی تھی تمہارے بھائی کے مقدر میں۔ یہ تو زمان خان کی لڑکی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں یہ میری خالہ کے پڑوس میں رہتی تھیں۔ یہ گھر سے بھاگ کر کوٹھے پر جا بیٹھی تھی یہ تو نگو طوائف ہے۔ اسے تمہاری کیامت ماری گئی تھی جو اسے اپنے گھر میں رکھ کر اپنی عزت کو بٹہ ہی لگا لیا۔''

یہ سننا تھا کہ ناصرہ بیگم جو کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں بیٹھی تھی وہیں بھری محفل میں انہوں نے حشر برپا کر دیا۔ سب کے سامنے زریں گل کا کچا چٹھا کھول کر انہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رکھا۔

''نہیں نہیں بھائی جان میں طوائف نہیں ہوں۔ آپ کو کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے۔'' انہوں نے شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے عاجزی سے کہا۔

''آپ سے کس نے کہا ناصرہ باجی۔ ذرا آپ اسے ہم سے بھی تو ملوایئے۔'' فواد کے پھوپھی زاد بھائی کی بیوی بولیں۔

''ہاں ہاں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ وہ تمہارے سیالکوٹ کی ہی رہنے والی ہے۔ بلکہ تمہاری مہمان ہے وہ ملک فضل دین کی سالی۔ شاہدہ پروین۔'' ناصرہ بیگم بہت تن کر بولیں۔ لیکن جب اسے بلوایا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ جا چکی ہے حالانکہ اب تک کھانا بھی سرد نہیں ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے وہ بھاگ گئی ہے تو میں بعد میں اس سے سمجھ لوں گی۔'' پھوپھی زاد بھائی کی بیوی بولی۔

''اے تم کیا سمجھ لو گی۔ ناک تو سارے خاندان میں ہماری کٹی ہے اس موئی بیسوا کو گھر میں رکھ کر۔ ایسی ہی اس سے ہمدردی ہے تو اسے اپنے پاس ہی رکھ لو تم ہی جیبوں میں یہ کھپ بھی جائے گی۔'' ناصرہ بیگم چیخ کر بولیں اور اس بات پر پورا جھگڑا ہی کھڑا ہو گیا پھوپھی زاد بھائی کی بیوی نسرین نے جو ملک برادری کی تھی۔ ناصرہ بیگم کو ایسی بے نقط سنائیں کہ انہیں اس کے گھر سے بھاگتے ہی بنی۔ مگر دل میں غصے اور حسد کی ایک بھٹی سی سلگ رہی تھی۔ گھر آ کر تو انہوں نے وہ ہنگامہ مچایا کہ ملک جواد جو کسی وجہ سے اس تقریب میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ بیوی کی زبانی زریں گل کا سارا حال احوال سن کر اپنے آپے میں نہ رہے اور مکوں اور لاتوں سے فواد کی تواضع کرتے ہوئے بولے۔

''کیوں بے تجھے غلاظت کے ڈھیر سے یہ گندگی ہی اٹھانی رہ گئی تھی بدبخت ایسی گرمی جھاڑنی تھی تو اس کے کوٹھے

پر چلا گیا ہوتا۔ میری عزت کو خاک میں ملانے اسے یہاں کیوں لایا۔ بتا مردود۔"

اور تب اس روز زندگی میں پہلی بار فواد کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے بھائی کی تیزی سے پڑتے ہوئے ہاتھوں کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر انہیں پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان' چھوٹے' بزرگوں کا اسی وقت تک ادب کرتے ہیں جب تک بزرگوں کو چھوٹوں کا لحاظ رہتا ہے اور آپ ہر لحاظ ختم کر چکے ہیں اور آج میں آپ کو صاف صاف بتا دوں کہ یہ ساری آگ بھابھی جان کی لگائی ہوئی ہے انہوں نے ہی یہ سارا فتنہ کھڑا کیا ہے اور یہ بھری محفل میں نسرین بھابی سے بھی لڑ کر آئی ہیں اصل میں تو زریں کو یہاں سے بھگا دینا چاہتی ہیں اور ان کا رویہ شروع سے میرے ساتھ جیسا بھی رہا ہے اس سے آپ لاعلم نہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر آپ کے خیال میں میں زریں کو گندگی کے ڈھیر سے اٹھا کر لایا ہوں تو یہ نہ بھولئے کہ اب وہ میری بیوی ہے اور اب میں اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کا متحمل نہ ہوں گا۔" اور ان کی اس جرات رندانہ پر ملک جواد ششدر سے انہیں دیکھتے رہ گئے اور بے یقینی سے انتہائی شدید کیفیت میں ناصرہ بیگم جیسی چرب زبان عورت سے بھی کوئی جواب نہ بن سکا اور فواد دونوں کو ان کی اپنی اپنی حالتوں میں چھوڑ کر تیزی سے ان کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

بھائی اور بھاوج کے سامنے برسوں کی جمع شدہ دل کی بھڑاس تو نکال آئے تھے مگر غصہ ابھی کم نہ ہوا تھا۔ بھری محفل میں اتنی بے عزتی ہوئی تھی کہ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اسی میں سما جائیں۔ حالانکہ زریں گل ان الزامات کی تردید ہی کر رہی تھی اور نسرین ان کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی۔ بلکہ آدھی برادری ہی زریں کی طرف دار تھی۔ پھر بھی وہ الجھ کر رہ گئے تھے شرمندگی تو پہلے ہی کھسیاہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی گھر آ کر بھاوج نے جو فساد مچایا تو ان جیسے بے پتا انسان کا خون بھی ڈول اٹھا۔ بھائی نے کمرے سے باہر نکل کر کچھ دیر تک اسی جذب کے علم میں ٹہلتے رہے۔ پھر تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئے۔

زریں گل بستر پر بیٹھی گھٹنوں میں منہ دیے سسکیاں بھر رہی تھیں وہ چند ثانیے تو اسی جذب کے عالم میں دروازہ بند کیا اور زریں کی طرف پلٹتے ہوئے بولے۔

"بہت زیادہ گریہ وزاری دوسرے کو شک وشبہات میں بھی مبتلا کر دیتی ہے زریں گل لیکن میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا ماسوا اس کے کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے۔ جس نے آج بھری محفل میں میری عزت کو خاک میں ملا دیا۔" لہجے میں تندی ہی نہیں طنز بھی تھا۔

"لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ سچ ہو سکتا ہے۔" زریں نے روتے روتے بھاری سی آواز میں الثان سے سوال کیا۔

''اگر یقین ہی ہوتا تو پھر میں تم سے کیوں پوچھتا۔'' زریں گل کی اشک چھلکاتی آنکھوں نے ان کے غصے پر ٹھنڈے چھینٹے سے مار دیئے۔

''پوچھنا ہی تو دراصل آپ کی عدم اعتمادی کی علامت ہے ملک فواد۔ اعتماد و یقین کی پختگی شک و شبہات کو دل کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی۔'' زریں گل گلہ آمیز سے لہجے میں بولیں۔

''یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔ تم ٹالنا چاہ رہی ہو تو اور بات ہے ورنہ میں نے تو تم سے اس بات کی صداقت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اب دیکھو نا جو بات عزت پر بنا دے اس کے بارے میں تحقیق تو کرنی ہی پڑتی ہے اور میں ویسے بھی تمہارے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''لیکن میں نے تو اپنا آپ آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ میں نے تو سب کچھ آپ کو بتا دیا تھا۔ کوئی ایک بات بھی نہیں چھپائی تھی۔'' زریں گل گلوگیر لہجے میں بولیں۔

''ہاں یہ تو مجھے بھی معلوم ہے اور میں تو اب بھی تمہاری ذات پر اندھا یقین رکھتا ہوں۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کا ایک مدلل جواب مجھے بھی تو دوسروں کو دینا ہے۔''

''مگر یہ بالکل جھوٹ ہے سراسر بہتان ہے ملک فواد۔ یقین جانیے اگر کوئی ایسی بات بھی ہوتی تو میں اسی روز آپ کو صاف بتا دیتی جس روز میں نے آپ کے سامنے اپنے ماضی کو عریاں کیا تھا۔'' زریں گل تڑپ کر بولیں۔ مگر وہ خاموش کھڑے بڑی گہری نظروں سے ان کی طرف دیکھتے رہے۔

''آپ کو یاد ہو شاید۔ اسی انجام کو ذہن میں رکھ کر ہی میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ خود کو میرا پابند نہ کریں اور اسی وجہ سے میں نے خود کو آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ یہ تک بتا دیا تھا کہ میں بکاؤ مال کی طرح ہوں۔ ماں نے اپنے سر سے میرا بوجھ اتارنے کی غرض سے اور پیسے کے لالچ میں مجھے ایک بوڑھے بردہ فروش کے ہاتھ پانچ ہزار روپے میں فروخت کر دیا تھا پھر وہ بڈھا زبردستی مجھے شہر لے آیا اور ایک بوڑھی طوائف کے ہاتھ مجھے دس ہزار روپے میں فروخت کر دیا اور پھر طوائف نے میری آبرو کی قیمت بیس ہزار روپے میں فروخت کر دیا اور پھر طوائف نے میری آبرو کی قیمت بیس ہزار روپے وصول کی اور کیا میں نے اس وقت آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ کہیں میرا ہاتھ تھام کر آپ کو زندگی بھر پچھتانا نہ پڑے مگر آپ نے اپنے جذباتی سے فیصلے کے آگے میری ایک نہ سنی۔ لیکن دیکھ لیجیے۔ اب چند ماہ میں ہی وہی نوبت آ گئی جس کی میں شروع ہی سے متوقع تھی۔'' زریں گل اپنی بات کہہ کر پھر رونے لگیں۔

''نہیں میرے خیال میں تو تم خود ہی عدم اعتماد کا شکار ہو گئی ہو۔ کیونکہ جب مرد شوہر بن جاتا ہے تو اس کی حیثیت ایک

حاکم کی سی ہو جاتی ہے اور کوئی حاکم اپنے کسی معتوب ماتحت سے اس کی تقصیر کی وجہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا بس کاغذ پر ایک کراس بناتا ہے اور ماتحت کو برطرف کر دیتا ہے لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تو صرف تم سے ساری تفصیل پوچھنا چاہ رہا تھا۔'' وہ زریں گل کی خوب صورت آنکھوں سے چھلکتے بے بسی کے آنسوؤں کو دیکھ کر ایک ہی موم ہو گئے۔

''میں تفصیل کیونکر بتاؤں جبکہ اس عورت نے میرے سامنے کچھ کہا ہی نہیں۔'' زریں گل سسکیاں لیتی ہوئی بولیں۔

''مگر کیا تم اس عورت سے واقف ہو جس نے یہ آگ لگائی ہے کیونکہ اب میں بھائی جان ہی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ وہ تو اس عورت کا نام بھی لے رہی تھیں یعنی انہوں نے یہ سب اپنے دل سے نہیں گھڑا۔''

''ہاں یہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن یقین جانیں میں اس عورت سے بالکل واقف نہیں البتہ جب نسرین بھابی نے اس عورت سے میرا تعارف کرایا تھا تو وہ مجھے دیکھی دیکھی ضرور لگتی تھی۔ زریں گل نے یقین دلانے کے سے انداز میں کہا۔

''ہوں!'' ان کی بات پر فواد کچھ سوچنے لگی پھر قدرے توقف کے بعد بولے۔

''وہ یقیناً تمہارے محلے میں ہی نہیں رہتی ہوگی۔''

''نہیں ہمارے محلے کے ایک ایک فرد سے ہماری شناسائی تھی۔ بالکل رشتے داروں کی طرح تھے ہمارے ہمسائے۔ میں نے تو اپنے محلے کے کسی گھر میں اسے رہتے نہیں دیکھا۔'' اپنی بات کہنے کے دوران زریں اپنے دماغ پر زور ڈالتی رہیں کہ شاید کچھ یاد آ جائے کہ اس عورت کو کہاں دیکھا تھا۔ اپنی بات کہنے کے بعد بھی وہ برابر یاد کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔

''جہاں تک میری سمجھ میں آیا ہے یہ پروین ضرور امی کی کوئی ملنے والی ہوگی۔ امی نے ہی ان کے سامنے میرے خلاف زہر اگلا ہوگا۔ انہوں نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی غرض سے مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرایا ہوگا۔ لیکن خیر کیا سچ ہے کیا جھوٹ میں اب بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ آپ میرے شہر کے محلے والوں سے اس کی تحقیق ضرور کرالیں۔

''نہیں نہیں تحقیق وحقیق کیسی تم نے تو بات ہی اتنی پتے کی کہی ہے کہ میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا ہے۔ یقیناً تمہاری سوتیلی ماں نے ہی اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے تم پر یہ الٹی سیدھی تہمتیں لگائی ہوں گی' میں تو اس صفائی ستھرائی کا بھی قائل نہیں تھا۔ یعنی اگر یہ بات غلط نہ بھی ہوتی تو میں یہی کہتا کہ تم بالکل پاک صاف اور محترم ہو۔ میری دل و جان کی مالک ہو۔ وہ تو بھائی جان اور بھابی جان کی زہر افشانی اور آتش بیانی کے میرے خیالات کو پراگندہ کر دیا تھا جو میں نے تم سے اتنا بھی پوچھ لیا۔'' پھر انہوں نے زریں گل کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر انہیں اپنے سینے سے لگا لیا اور شوہر کی ہمدردی اور محبت پا کر زریں گل بلک پڑیں۔

''میں......میں نے صرف آپ کی خاطر اپنے اندر جینے کی امنگ پیدا کی تھی فواد اور آپ ہی کی خاطر جی رہی ہوں۔ خدارا آپ لوگوں کے بھڑکانے میں بالکل نہ آیا کیجیے۔ کیونکہ آپ نے اگر لوگوں کے کہنے میں آ کر زریں گل کو دھتکار دیا تو زریں گل زندہ رہنے کا مفہوم بھول جائے گی فواد۔''

''اوہ......تو......تو زندہ رہنے کا شعور تو فواد نے تم سے ہی سیکھا ہے جاناں۔ ورنہ اس سے پہلے تو فواد زندگی کو ایک بوجھ ایک عذاب ہی سمجھتا رہا تھا تمہارے بغیر تو فواد ادھورا اور ناکارہ ہے۔ تم خدانخواستہ اس کی زندگی سے نکل گئیں تو فواد بن آئی ہی مر جائے گا۔'' اور ان کی بات پر زریں گل نے تڑپ کر ان کے منہ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ دیا۔

''اف۔ توبہ توبہ کیسی بدشگونی کی باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔'' اور فواد ان کی اس حرکت پر زور زور سے ہنسنے لگے۔

اف آہستہ ہنسیے اگر کسی نے سن لیا تو پھر شامت ہی آ جائے گی۔'' زریں گل نے انہیں فوراً ٹوکا۔

''نہیں اب شامت آنے کا وقت گزر چکا ہے زریں گل۔ آج میری بھائی جان سے کھل کر بات ہوگئی ہے اور آج ہی انہیں یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جب اولاد یا بہن بھائی برابر کے لگنے لگتے ہیں تو ان سے کیسے بات کرنی چاہیے۔ میرا مطلب ہے کہ اب وہ کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔ ویسے بھی اب میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کسی قیمت پر بھی یہاں نہیں رہوں گا۔ ایک دن کے لیے بھی نہیں کیونکہ ان لوگوں کی تم سے بدسلوکی اور اہانت اب میری برداشت سے باہر ہوگئی ہے۔'' وہ زریں گل کے ریشمی بالوں پر اپنا رخسار ٹکا کر کہتے رہے۔

''لیکن ہم یہ گھر چھوڑ کر آخر کہاں جائیں گے۔ ہمارا تو کوئی اور ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔'' زریں گل سیدھی ہو کر بیٹھتی ہوئی متفکر سے انداز میں بولیں اور وہ ان کی طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائے اور پھر انہوں نے گھمبیر سے لہجے میں کہا۔

''جب موسم تبدیل ہونے لگتا ہے تو شاید تم نے غور کیا ہو کہ پرندے ناموافق آب و ہوا کی وجہ سے اپنے آشیانے چھوڑ کر ان ممالک کا رخ کرتے ہیں جہاں کا موسم انہیں راس آ جائے اور پھر وہیں از سر نو اپنے اپنے آشیانے تعمیر کرتے ہیں۔ جبکہ انسان کو تو خدا نے عقل دی ہے اور دو ہاتھ اور دو پاؤں بھی دیئے ہیں اور سوجھ بوجھ کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر ناہوت میں سوجھ بوجھ اور عقل بھی ناکارہ ہو جاتی ہے اور ہم چرند پرند نہیں بلکہ انسان ہیں جو تنکوں اور گھاس پھونس کا نہیں لگا رہے اور سیمنٹ کا آشیانہ بناتا ہے اور گارا اور سیمنٹ سی گفتگو پر قدرے چڑ کر بولیں۔

''تو گویا سارا زور پیسے پر ہوا نا۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔ اور پھر یک لخت سنجیدہ ہو کر بولے۔

''مگر اس ذلت اور خواری کی زندگی سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم کسی فٹ پاتھ پر جا رہیں۔ آخر ظلم اور زیادتی کی کوئی انتہا بھی ہوتی ہے۔ میری برداشت تو اب جواب دے چکی ہے اور پھر تمہارا اب اس گھر میں رہنا کسی طور پر بھی مناسب

نہیں۔ کم از کم میری غیرت تو گوارا نہیں کرتی ویسے بھی ہم لوگ سدا بھائی کے در پر تو نہیں پڑے رہیں گے۔ ہمیں اپنا حال اور اپنا مستقبل بھی تو سنوارنا ہے اور وہ اسی صورت میں سنور سکتا ہے جب ہم قطعی طور پر اپنے اختیارات استعمال کریں گے۔ یعنی انڈیپینڈنٹ ہو جائیں گے۔'' زریں گل جو دل سے یہی چاہتی تھیں کہ وہ اپنا کہیں اور ٹھکانا کر لیں۔ انہوں نے بھی دل ہی دل میں میاں کی بات کی تائید کرتے ہوئے پر خیال انداز میں کہا۔

''میرا کیا ہے مجھے آپ سڑک پر بھی بٹھا دیں گے تو بیٹھ جاؤں گی کہ آپ کی رفاقت اور پیار ہی میرے لیے سب کچھ ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ ان روپوں اور زیورات کو آپ اس آڑے وقت میں کام میں لے آتے۔ آخر آپ اور میں الگ تو نہیں ہیں۔''

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ برے سے برے وقت میں بھی اپنے ان روپوں کو میرے اور اپنے درمیان نہ لانا۔'' فواد بڑی ناگواری سے بولے۔

''نہ معلوم آپ ان روپوں کو کیا سمجھ رہے ہیں۔ جبکہ یہ میرا حق ہے میرا اپنا پیسہ ہے فواد۔ یہ دس ہزار کی رقم بمعہ ان زیورات میری مرحومہ ماں نے میرے ماموں کے پاس رکھوائی تھی کہ جب میں بالغ اور دانا ہو جاؤں تو وہ اس پیسے کو میرے حوالے کر دیں اور ماموں نے مرتے وقت یہ میری امانت مجھے سونپ دی تھی خدا کی قسم پیسے کے لالچ میں فروخت کر رہی ہیں تو میں یہ ساری رقم اور زیورات ان کے قدموں میں ڈال دیتی اور یوں ٹھکانے سے بے ٹھکانہ نہ ہوتی۔'' زریں گل نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''تم بہت غلط سمجھ رہی ہو زریں۔ میں تمہارا پیسہ اس لیے اپنے اوپر حرام سمجھتا ہوں کہ اگر میں نے اسے استعمال کر لیا تو پھر میں زندگی بھر کے لیے نکما اور ناکارہ ہو جاؤں گا۔ میں خود اپنی محنت اور زور بازو سے اپنا مستقبل روشن بنانا چاہتا ہوں کیونکہ میں سیلف میڈ ہوں۔ سمجھ گئیں نا یعنی خود اپنے آپ کو بنانے والا......'' آخری فقرہ انہوں نے اپنے مکے ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

''واہ عجیب منطق ہے آپ خیر چلیں اگر آپ خود کو کچھ بنانا بھی چاہتی ہیں تو یہ کیوں بھول گئے میری ذمہ داری بھی آپ پر ہے آپ بلا پیسے کس طرح کچھ کر سکیں گے۔'' زریں گل نے کہا اور پھر کچھ سوچ کر پر خیال انداز میں بولیں۔

''اوہ ہاں آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بھائی جان سے کہہ کر اپنا حصہ الگ کروا لیں۔ آخر اس جائیداد میں آپ آدھے کے شریک بھی تو ہیں اور پھر آپ کا حق بھی بنتا ہے۔''

''اصل میں اسی مسئلے نے ہمارے لیے اتنی مشکلات کھڑی کر رکھی ہیں بھابھی جان شروع سے یہی تو چاہتے آرہے

ہیں کہ کسی طور پر یا تو میں ان کے راستے سے ہٹ جاؤں یا پھر اپنے حصے سے دستبردار ہو جاؤں۔ وہ یا بھائی جان بھلا میرے جائیداد کے مطالبے کو قبول کر لیں گے۔ الٹا ایسا دھماکہ ہوگا کہ جس میں میرا تمہارا وجود ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔" فواد نے کہا۔

"وہ تو ہونا یقینی ہے لیکن کم از کم اس طرح بھائی جان کے خیالات اور نیت کا بھی علم ہو جائے گا۔ بشرطیکہ آپ ان سے یہ سب کہنے کی اپنے میں ہمت پیدا کریں اور پھر آخر انصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔ مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی ان کے نہ ماننے کی۔" زریں گل نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ اگر ان کے اندر ایک ذرا سا بھی انصاف کا مادہ ہوتا تو پھر آج ہم یوں ان کی اہانت اور تحقیر کا نشانہ نہ بنتے۔ بہر حال تم نے مجھے ایک بہت اچھی راہ دکھائی ہے۔ میں اس مسئلے پر بھائی جان سے ضرور بات کروں گا۔" فواد نے زریں گل کے مشورے کو دل ہی دل میں سراہتے ہوئے کہا اور پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"لیکن آج تم اپنا اور میرا سامان ضرور باندھ لو کیونکہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ جائیداد سے میرا حق ملنے یا نہ ملنے میں تو بس تہیہ کر چکا ہوں کہ اب یہاں کسی قیمت پر نہ رہوں گا۔" اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"ہیں تو آپ اسی وقت بھائی جان سے بات کرنے جا رہے ہیں۔" زریں گل نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"نہیں، میں تو لباس تبدیل کر کے لیٹنے کی سوچ رہا ہوں۔ سارے دن کی کوفت اور پریشانی نے مجھے بری طرح تھکا دیا ہے اور بھائی جان سے تو میں پھر کبھی بات کروں گا پہلے کل صبح پرویز بھائی کے پاس جاؤں گا شاید وہ ہمیں کوٹھڑی یا کمرہ کرائے پر دلوا دیں۔" فواد نے جواب میں بتایا اور پھر لباس تبدیل کرنے چلے۔

مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے فواد ابھی ڈھنگ سے لباس بھی تبدیل نہیں کرنے پائے تھے کہ آگے آگے ناصرہ بیگم اور ان کے پیچھے ملک جواد دندناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور زریں جو ابھی تک بستر پر ہی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھیں انہیں یوں ناگہانی کی طرح کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر جلدی سے دوپٹہ سر پر اوڑھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جواد صاحب نے بڑھ کر ان سے کہا۔

"آج کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم دونوں میرے گھر میں رہنے کے قابل نہیں ہو اور میں ایک منٹ بھی تمہاری یہاں موجودگی گوارا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ میں غلام علی اور فتح علی کو بلوا کر تمہیں بہت بے عزت کر کے گھر سے نکالوں گا۔" غلام علی اور فتح علی ناصرہ بیگم کے آوارہ اور بدمعاش بھائی تھے زریں تو ان کی اس دھمکی پر پیلی ہی پڑ گئیں مگر فواد جو کونے میں کھڑے کپڑے تبدیل کر رہے تھے۔

کرتے کو گلے میں ڈال کر ان کی طرف آتے ہوئے بولے۔

''نہیں کسی کو بلانے چلانے کی ضرورت نہیں بھائی جان ہم خود بھی یہی فیصلہ کر چلے ہیں کہ اب ایک دن بھی یہاں نہیں رہیں گے مگر۔''

''اے شکر الحمدللہ کچھ تو غیرت جاگی تمہاری۔'' ناصرہ بیگم تمسخر سے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر بولیں۔

''جی ہاں آپ کی نوازش سے ہی جاگی ہے لیکن میں صرف ایک شرط پر یہاں سے جاؤں گا۔''

''کونسی شرط۔'' ناصرہ بیگم نے چمک کر پوچھا۔

''لاحول ولا۔ پھر تم بیچ میں بولیں۔'' جواد صاحب نے بیوی کو فوراً ٹوکا اور پھر ان کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''ہاں تو بے کیا شرطیں ورطیں لگا رہا ہے۔''

''شرطیں تو نہیں فی الحال تو صرف ایک شرط ہی لگا رہا ہوں۔'' فواد متانت سے بولے۔

''تو کسی طرح پھوٹ بھی چک!'' ناصرہ بیگم نے پھر دخل در معقولات کیا۔

''اس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے براہ کرم آپ بیچ میں نہ بولیں۔'' فواد نے غیر روادارانہ لہجے میں ان سے کہا۔

''تم چپکی نہیں ہوگی۔'' جواد صاحب نے حسب عادت وہی جملہ کہا جو وہ اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے۔ تو ناصرہ بیگم منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئیں۔

''ہاں تو میری صرف ایک ہی شرط ہے شرافت سے یہاں سے جانے کی کہ آپ جائیداد میں سے میرا حصہ الگ کر دیں۔ ورنہ غلام علی اور فتح علی کی کیا حیثیت اگر ان کے باوا جان بھی قبر سے نکل کر مجھے ڈرانے دھمکانے آ جائیں تو میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔''

''اے اے لو دیکھ رہے ہو ایک تو چوری اس پر سے سینہ زوری۔ ایک تو اتنا ہاتھوں سے نکل گیا کہ بڑے بھائی پر آج ہاتھ اٹھایا اس پر اب میرے مرے ہوئے باپ کا نام لے رہا ہے۔ موا صورت حرام کہیں کا۔ اے کونسی ایسی لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے۔ تمہارے باوا جان جو اب اس کا حصہ بخرہ بھی ہوگا۔ یہ تو جو کچھ بھی ان کے پاس ہے سب ان کی اپنی محنت کا ہے لو اور پالو اسے۔ کھلاؤ پلاؤ۔ پڑھواؤ اور خیال رکھو۔ دے دیا نا اس نے موت کا چلو تمہارے ہاتھ میں۔ ارے اس کے تو خون میں ہی غداری بسی ہوئی ہے موا نطفہ حرام۔''

''اپنی زبان کو لگام دیجئے بھائی جان۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے اگر میں نے بھی جواب میں کچھ کہہ دیا تو آپ کی کیا رہ جائے گی۔'' فواد ان کی گالی برداشت نہ کر سکے تو پوری قوت سے دہاڑے۔

''اے لو دیکھ رہے ہو ملک صاحب یہ بدذات کیا کہہ رہا ہے۔'' ناصرہ بیگم نے جان کر جواد صاحب کو بھڑکانا چاہا۔

''یہ تو جو کچھ بھی کہہ رہا ہے اس کا میں اسے ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ یہ یاد رکھے گا لیکن پہلے مجھے اس سے بات تو کرنے دو۔'' بیوی کے بار بار دخل دینے پر شاید جواد صاحب بھی بیزار ہو گئے تھے۔

''ہاں تو بے کیا تڑی دے رہا تھا مجھے اپنی طرم خانی کی۔'' انہوں نے اپنی بات ختم کر کے فواد کو مخاطب کیا۔

''تڑی میں آپ کو نہیں بلکہ آپ مجھے دے رہے تھے وہ ماشاء اللہ بھائی جان کے بہت ہی شریف النفس اور عزت دار بھائیوں کی ورنہ میں تو صرف آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اس جائیداد میں جس پر آپ قابض ہوئے بیٹھے ہیں۔ میرا بھی برابر کا حصہ ہے اور جس طرح آپ ٹھاٹھ سے اس گھر میں رہ رہے ہیں اسی طرح مجھے بھی اس گھر میں رہنے کا پورا پورا حق حاصل ہے میں ان دونوں کو بڑی آسانی سے حوالات میں بند کرا سکتا ہوں اور ان کے مچلکے تو اب کرا کے ہی رہوں گا۔''

اف یہ فواد کہہ رہا تھا۔ وہ بھائی بول رہا تھا جس کی جواد صاحب کی نظروں میں کوئی وقعت تھی نہ اہمیت۔ اور جسے وہ بہت بے زبان، بے بہا اور زر خرید ہی سمجھتے تھے۔ وہ قانون کو ہاتھ میں لے کر ایسی عاقلانہ اور مدلل گفتگو کر رہا تھا کہ وہ چکرا کر رہ گئے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو لعنت ملامت پر اتر آئے۔

''اچھا تو میں بھی دیکھ لوں گا کہ تو میرا کیا بگاڑ سکتا ہے نمک حرام۔ کیا میں نے تجھے اسی لیے پالا تھا۔ اسی غرض سے تعلیم دلوائی تھی کہ تو بڑا ہو کر مجھ پر غرائے۔ مجھے دھمکیاں دے اور ہاتھ اٹھائے۔''

''اس طرح پالنے سے تو بہتر تھا آپ میرا گلا گھونٹ کر میرا قصہ ہی تمام کر دیتے بھائی جان۔ تاکہ کم از کم اس ذلت اور تحقیر سے ان ایذاؤں سے جو آپ کی اہلیہ صاحبہ نے مجھے پہنچائی ہیں میں ان سے تو بچ جاتا۔'' فواد نے دلگیر سے لہجے میں کہا۔ تو بری طرح پیچ و تاب کھاتی ناصرہ بیگم سے پھر خاموش نہ رہا گیا۔

''دیکھا ملک صاحب میں نہ کہتی تھی کہ یہ آپ کے لیے ٹھہرا ہوا سانپ ثابت ہو گا کہ جیسے ہی گرمی پہنچے گی آپ کو ڈس لے گا...... ہونہہ بڑا آیا جائیداد کا حقدار بن کر۔ ایک روکھی کا کھوکھا کھولا تھا آپ کے باوا نے تو آپ ہی نے دن رات محنت کر کے اور اپنا خون پسینہ ایک کر کے یہ دوکان اور جائیداد بڑھوائی ہے بھلا اس کی کیا حیثیت ہوتے ہیں اس پر حق جتانے کی مجھے معلوم ہے یہ ساری باتیں یہ میرے تیمور کے حسد جلن میں کر رہا ہے۔ جبھی تو سگا چچا ہو کر اس معصوم بچے سے ایسا خار کھاتا ہے کہ پیار کرنا تو کجا سیدھے منہ اس سے بات تک نہ کرتا۔''

''میں اسے پیار نہیں کرتا یا آپ نے اسے ایسی تربیت دی ہے کہ وہ مجھے اپنا دشمن سمجھتا ہے ابھی سے مجھ سے سخت نفرت کرنے لگا ہے کیونکہ آپ اس کے سامنے مجھے ذلیل و خوار کرتی ہیں حتیٰ کہ مار تک لیتی ہیں اور اس سے یہی کہتی ہیں

کہ یہ تمہارا اچھا نہیں دشمن ہے اس سے بچ کر رہا کرو۔ ورنہ یہ کسی دن تمہارا گلا کاٹ دے گا۔'' فواد اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔ اوران کی بات پر جواد صاحب نے بیوی کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا تو وہ اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی غرض سے جلدی سے بولیں۔

''اے جب تیری یہاں ذلت بھی ہوتی ہے۔ تجھے سب اپنا دشمن بھی سمجھتے ہیں تو پھر تو یہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا۔ خیر میں تو چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے اس فاحشہ کو اپنے یہاں مر کر بھی نہ رکھوں گی۔ اے ہاں یہ میرا گھر ہے۔ موا کوئی چکلہ نہیں ہے کہ کوٹھوں پر سے اتر کر بیسوائیں یہاں آئیں۔''

''اسے تو یہاں سے آپ کے یہ شوہر نامدار بھی نہیں نکال سکتے تو پھر آپ کی تو اوقات ہی کیا ہے اور مجھے معلوم ہے برادری بھر کے سامنے آپ نے یہ سارا فتنہ اسی لیے کھڑا کیا تھا کہ ہمیں رسوا کر کے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیں لیکن میں اب یہاں سے نکلوں گا تو مر کر ہی نکلوں گا۔ جایئے جیسے پہلے ایک بار آپ نے اپنے مجرم بھائی کے ذریعہ پانی کی ٹنکی میں گروا کر مروانا چاہا تھا تو اب خود اپنے ہاتھوں سے ایسا کوئی زہر بھی تیار کر لیجیے جو جلد از جلد ہم دونوں کا کام تمام کر دے۔'' فواد اپنی قابل احترام بیوی کے بارے میں ایسے نامناسب اور نازیبا الفاظ سن کر اپنے غصے پر قابو نہ پا سکے اور ناصرہ بیگم جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ جواد صاحب بولے۔

''بس اب کچھ کہنا بیکار ہی ہوگا کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ اسے یہاں سے نکالنے کا میں کوئی دوسرا ہی بندوبست کروں گا۔'' اور پھر بیوی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گئے۔

''ہونہہ کوئی اور بندوبست کروں گا۔ آنکھیں نہیں کھلی ہیں اس کی۔ جس دن ہوش آئے گا تو تڑپتے رہ جائیں گے۔'' فواد آہستہ سے بڑبڑائے۔

''اصل میں تو یہ دونوں ایسے ہی سلوک کے مستحق تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے آج ان کا دماغ درست کر دیا۔'' زریں گل جو ڈری سہمی اتنی دیر سے' خاموش کھڑی تھیں دونوں میاں بیوی کے جانے کے بعد سراہتے ہوئے انداز میں بولیں اور پھر آہستہ سے فواد کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ جو اتنا ڈرپوک' بزدل' بے زبان اور بے پتا تھا تو یہ ایک دم ہی میرے اندر اتنی ہمت کیسے پیدا ہوئی۔ کیونکر مجھے اچانک ہی زبان مل گئی۔'' فواد نے انہیں خود سے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے حالات کی وجہ سے۔'' زریں گل نے قیاس آرائی کی۔

''نہیں بلکہ تم نے۔ تمہاری طبیعت کے ٹھوس پن اور مستقل مزاجی نے ہی مجھے اتنا دلیر اور زبان دراز بنا دیا ہے۔

جس دن سے تم آئی ہو۔ میری زبان پر لگے قفل کھل گئے ہیں۔ تمہاری رفاقت نے میرے دل کی دم توڑتی امنگوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ تمہاری معیت نے مجھے خود اعتمادی اور حوصلہ مندی کی قوت بخشی ہے تمہاری گھمبیرتا نے مجھے احساسات کی شدت سے نوازا ہے جبھی تو کچھ کہنے سے پہلے مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس بولنے پر آتا ہوں تو بولتا ہی چلا جاتا ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری زبان تمہارے احساسات کی ترجمانی بن گئی ہو۔" تو زریں گل پیار سے ان کے شانے پر اپنا رخسار رگڑتیں ہوئی بولیں۔

"بس اب مجھے زیادہ نہ چڑھایئے۔ آیئے اب سوتے ہیں آج واقعی ہم سکھ کی نیند سوئیں گے۔" اور جواب میں فواد نے انہیں خود سے لپٹا لیا اور بولے۔

"سکھ کی نیند ہی نہیں سکھ چین کی بنسری بجائیں گے اب تو۔"

"مگر دیکھی تم نے قدرت کی کرشمہ سازی کہ یا تو ہمیں ایک منٹ بھی یہاں رہنا گوارا نہ تھا یا آن کی آن میں ایسے حالات پیدا کر دیئے اب ساری عمر بھی یہاں دھرنا دے کر بیٹھے رہے کوئی ہمیں نہیں نکال سکتا۔" فواد نے بیچ میں کچھ توقف کر کے پھر کہا۔

"لیکن یہاں رہنے میں تو وہی ہر وقت کی بک بک جھک جھک ہی قائم رہے گی۔" زریں گل کچھ پریشان ہو کر بولیں۔

"نہیں اب اس کا امکان نہیں اور اگر ہو بھی تو پھر اب تم بھی ان سے پیچھے نہ رہنا۔" فواد نے انہیں خود سے لپٹائے لپٹائے بستر کی جانب بڑھتے ہوئے جذباتی سے لہجے میں بولی اور زریں گل شوہر کے بدن کی مہک میں کھو سی گئیں۔

پھر کئی روز اتنے امن چین سے گزرے کہ شاید محلے والوں نے بھی سکھ کا سانس لیا ہوگا اور فواد تقریباً روز ہی بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر کہتے۔

"دیکھا میرا بولنا کس قدر کام آیا۔ ورنہ اگر ڈر کے مارے گونگی ہڑپ کیے رہتا تو بھائی جان صاحب میرا حق کھا کر ڈکار بھی نہ لیتے۔" اور زریں گل مسکرا کر رہ جاتیں۔ کیونکہ وہ اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی تھیں اور پھر وہ ناصرہ بیگم جیسی شاطر' چالاک اور لالچی عورت کا بڑا گہرا مطالعہ کر چکی تھیں اور ان کی بچھو جیسی فطرت سے بھی واقف تھیں اس لیے ان کی خاموشی سے بھی انہیں ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا اور اپنے اس حدشے کا اظہار وہ دبی زبان سے فواد کے سامنے بھی کر چکی تھیں۔ مگر فواد ہمیشہ ان کی بات کو ان کے وہم پر محمول کرتے' لاپرواہی میں اڑا دیتے تھے۔ پھر دو ڈھائی ماہ اسی طرح یعنی امن چین سے گزر گئے اور زریں گل کے خدشات باطل ہی ثابت ہوئے۔

فواد کا قاعدہ تھا کہ وہ صبح ساڑھے آٹھ بجے تیار ہو کر کالج جانے کے لیے گھر سے نکلتے اور دوپہر ڈھائی بجے تک واپس آتے اور اپنا زریں گل کا کھانا بھی ساتھ ہی لاتے۔ کیونکہ ابھی گھر پر کھانا پکانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور وجہ وہی ناموت تھی۔ بس کالج سے واپسی پر اگر اور کچھ نہ لے سکتے تو صرف دو نان ہی لے لیتے تھے پھر کھانا کھا کر ایک آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ٹیوشنز پڑھانے چل دیتے اور اس کے بعد اپنی نوکری پر چلے جاتے تو واپسی مغرب کے بعد ہی ہوتی کبھی پیدل آنا پڑتا تو رات کے آٹھ بھی بج جاتے۔

مگر اس روز تو وہ دن کو بھی نہیں آئے تھے۔ جبکہ خواہ کیسا ہی موسم ہوتا کتنی ہی تھکن سوار ہوتی یا پیدل ہی چل کر آنا پڑتا فواد دوپہر کو گھر میں ضرور آتے۔ مگر اس روز وہ دوپہر کو آئے تھے نہ اب رات کے نو بج رہے تھے ان کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ زریں گل کی پریشانی دیدنی تھی۔ گھر میں تو سب بدخواہ ہی تھے کہ کسی سے اپنی پریشانی کا ذکر کرتیں۔ ایک لے دے کے رکھی ہی تھی مگر وہ کئی ماہ سے اپنی بیٹی جیراں کی بات طے کرنے اپنے رشتے داروں کے پاس گاؤں گئی ہوئی تھی۔ اب یہ کسے معلوم تھا کہ رکھی کو جان بوجھ کر ناصرہ بیگم نے نکالا ہے اور اس روز اتفاق سے جواب صاحب بھی گھر میں موجود نہیں تھے۔ وہ زمینوں کی آمدنی کا سالانہ حساب کرنے دو روز قبل ہی گئے تھے۔ زریں گل بار بار اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آتیں اسی امید پر کہ شاید داخلی دروازے سے میاں آتے نظر آجائیں مگر ہر بار انہیں مایوس ہونا پڑتا۔ اسی وجہ سے وہ تنگ آکر کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی تھی کہ کوئی گیارہ بجے کے قریب دروازے کو زور زور سے پیٹا جانے لگا اور دھڑ دھڑانے کا یہ انداز ان کی جان پر بنا گیا۔ کہیں خدانہ کرے کوئی بری خبر نہ ہو۔ آخر یہ اس وقت کون آیا ہے۔ فواد کے کھٹکھٹانے کا یہ انداز تو نہیں۔ انہوں نے سہم کر دل میں سوچا۔ اس دوران دستک برابر جاری رہی مگر گھر میں سے کسی نے بھی اس کا جواب نہ دیا۔ تو زریں گل ان لوگوں کی بے حسی اور بداخلاقی کو روتی خود ہی اٹھ کر دروازے کے نزدیک آگئیں لیکن احتیاطاً اسے کھولا نہیں بلکہ اس سے منہ لگا کر پوچھا۔

''کون صاحب ہیں۔''

''دروازہ کھولو بی بی۔ ہم ملک صاحب کو یہ اطلاع دینے آئے ہیں کہ ان کے بھائی کا ٹرک سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ بڑی نازک حالت میں ہسپتال میں پڑے ہیں۔'' اور اس خبر بد نے زریں کے حواس ہی معطل کر کے رکھ دیے جلدی سے دروازہ کھولا اور آڑ میں کھڑی ہو کر پوچھا۔

''کب ہوا ایکسیڈنٹ اور کہاں ہوا۔ خدارا ذرا تفصیل سے بتائیے۔''

''بی بی یہ تو میرے کو ملوم نہیں۔ بس چھوٹا ملک جس کمپنی میں پگھار بانٹنے جاتا ہے اسی کمپنی میں چوکیدار لگا ہوا ہوں

اور ٹھیکیدار نے مجھے اطلاع دینے ملک صاحب کے پاس بھیجا ہے۔'' وہ شخص جو خاصا معمر تھا بڑی رسانیت سے بولا۔
زریں نے جھری میں جھانک کر دیکھا وہ تین آدمی تھے۔
''مگر...... مگر...... بڑے ملک تو زمینوں پر گئے ہوئے ہیں تین روز سے اب میں کہوں تو کس سے کہوں۔ ویسے ان کی حالت تو اطمینان بخش ہے۔'' زریں گل ہراساں ہو کر بولیں۔
''بس جی دعا کی ضرورت ہے کیونکہ زندگی تو خدا دینے والا ہے۔ پر گھر میں کوئی اور نہیں ہے۔'' اس شخص نے پوچھا۔
''ہاں میں کیوں نہیں مگر تم کہاں سے آئے ہو کیا یہی وقت رہ گیا تھا یہاں آنے کا۔'' زریں جواب میں کچھ کہنے ہی جا رہی تھیں کہ دفعتاً پیچھے سے ناصرہ بیگم کی کراری آواز سنائی دی۔
''وہ...... بھائی جان یہ وہ فواد۔'' زریں نے بتانا چاہا مگر ان کا گلا رندھ گیا اور وہ رونے لگیں۔
''ہونہہ۔ جس دن سے آئی ہو۔ ٹسوے ہی بہاتے نظر آتی ہو۔ مجھے تو وہم ہو گیا ہے تمہارے ہر وقت کے رونے دھونے سے۔ صاف صاف بتاؤ کہ بات کیا ہے آ کر کوئی مر تو نہیں گیا جو تمہارے منہ سے بات نہیں نکل رہی۔'' ناصرہ بیگم نے اپنے طنز بھرے لہجے میں حقارت سی شامل کر کے کہا تو زریں سہم کر بولیں۔
''ان...... نہیں نہیں خدا نہ کرے۔ ان کا صرف ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔''
''اے کن کا۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتی۔'' ناصرہ بیگم چیختے ہوئے انداز میں بولیں۔
''چھوٹے ملک کا جی ملکانی جی۔'' زریں کے بجائے ایک اور شخص نے بتایا۔
''اچھا۔ تو پھر تم کیوں آئے ہو۔''
''جی اطلاع دینے...... جروری تھا نا۔'' بڈھے نے کہا۔
''ہونہہ۔ جروری تھا نا...... لے کے آ گئے آدھی رات کو بے آرام کرنے۔ جاؤ...... اپنا راستہ ناپو۔'' اتنا کہہ کر ناصرہ بیگم نے دروازہ بند کر دیا تو زریں جو سخت ہراساں ہو رہی تھیں لجاجت سے بولیں۔
''بھائی جان اگر آپ اجازت دیں تو میں حنیفاں کو ساتھ لے کر چلی جاؤں آ کر کسی کو تو اس کے پاس ہونا چاہیے۔''
''حنیفاں کو ساتھ لے کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تو تو ایرے غیروں کے ساتھ جانے کی عادی ہے۔ جا خود ہی چلی جا۔'' ناصرہ بیگم ترخ کر بولیں۔ زریں شوہر کے طرف سے اس قدر ہراساں اور فکر مند ہو رہی تھیں کہ فوراً جانے پر راضی ہو گئیں۔ مگر پھر انہوں نے سوچا کہ اس وقت ان اجنبی مردوں کے ساتھ ان کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں نہ ان لوگوں سے

ہسپتال کا پتا لے لیں اور صبح سویرے ہی روانہ ہو جائیں۔ اسی خیال سے انہوں نے جلدی سے دروازہ کھول کر کہا۔
''سنیں۔''
''پھر مائیں بی بی۔''
''آپ مجھے ہسپتال کا پتا اور ان کے کمرے کا نمبر بتا دیں۔ میں صبح خود چلی جاؤں گی۔ اچھا ٹھہریں میں کاغذ اور قلم لے آتی ہوں۔''
اور اتنا کہہ کر جونہی زریں اپنے کمرے کی طرف پلٹیں پیچھے سے انہیں کسی نے اس بری طرح اپنے شکنجے میں جکڑا کہ وہ آواز بھی نہ نکال سکیں کیونکہ کسی نے ان کے منہ میں کپڑا ٹھونسا تھا اور بس وہ اپنی دہشت زدہ آنکھوں سے صرف اتنا دیکھ سکیں کہ ان کی جیٹھانی وہاں سے کہیں غائب ہو گئیں۔ پھر ان کی آنکھیں بند ہوتی گئیں اور انہیں ہوش نہ رہا۔
رات کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ جب فواد نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ مارا تو دروازہ خود بخود ہی کھل گیا۔ پورا گھر سناٹے اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا حتیٰ کہ ان کا کمرہ بھی۔
''بھائی جان چلے گئے ہیں تو یہ سب لوگ کتنے لاپرواہ ہو گئے ہیں۔ اب اگر میرے بجائے کوئی چور اچکا ہوتا تو کتنے مزے میں گھر کا صفایا ہی کر جاتا۔'' انہوں نے پلٹ کر دروازے کی کنڈی لگاتے ہوئے دل میں سوچا اور دبے پاؤں چلتے اپنے کمرے میں آ گئے۔ ''ہوں تو زریں واقعی بری طرح روٹھ گئی ہے تبھی تو یوں بلیک آؤٹ کیے پڑی ہے مگر خیر جب میں اسے یہ بتاؤں گا کہ بلیک آؤٹ کرنے کے بجائے گھی کے چراغ جلاؤ کیونکہ تمہارے سر کا تاج صحیح سلامت واپس آ گیا ہے اور وہ پورا واقعہ سنے گی تو اس کی ساری ناراضگی بھک سے اڑ جائے گی۔'' پھر انہیں آج کا واقعہ یاد آ گیا۔
وہ اپنے کالج سے نکل کر بازار میں کھڑے زریں کے لیے آم خرید رہے تھے۔ آموں کے پیسے انہوں نے دو روز تک کالج اور اپنی ٹیوشنز اور ملازمت پر پیدل آنے اور جانے کی صورت میں دو روز کا کرایہ جمع کر کے بچائے تھے کیونکہ زریں کو آم بہت مرغوب تھے اور وہ ایک سیر لنگڑا آم خرید کر پلٹ ہی رہے تھے کہ دو آدمی بھاگتے ہوئے آئے اور ان کے قریب آ کر آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغلظات گالیوں کا ملغوبہ بھی ان کے منہ سے نکل رہا تھا۔
یہ صورت حال دیکھ کر اور بھی بہت سے لوگ ان کے اردگرد جمع ہو گئے اور چونکہ فواد ان دونوں لڑکے والوں کے بالکل قریب کھڑے تھے اس لیے چاروں طرف سے گھر گئے تھے۔ اردگرد کھڑی بھیڑ اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھی کہ بھیڑ ہی میں سے ایک شخص نے بڑھ کر انہیں ایک بہت ہی غلیظ گالی سے نوازتے ہوئے کہا۔ ''ابے شرم نہیں آتی تجھے جو چپکا کھڑا تماشہ دیکھ رہا ہے کہ تو بیچ بچاؤ نہیں کرا سکتا۔''

فواد نے بھلا یوں سرعام کسی کے منہ سے گالی کب سنی تھی۔ انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس شخص کے مارتے ہوئے کہا۔ "خبردار جو مجھے گالی دی۔ ایسا ہی تجھے شوق ہے تو تو خود بیچ بچاؤ کرالے۔" مگر تھپڑ کھا کر تو وہ آدمی آگ بگولا ہوگیا اور اپنے ساتھیوں کو پکار کر ان پر پل پڑا۔ فواد بھی جوابی کارروائی کرتے رہے مگر اس شخص کے دو ساتھی اور آ گئے اور ان تینوں نے مل کر فرواد کو اتنا مارا کہ وہ بیڈ سے ہو کر زمین پر گر پڑے وہ تو دو پولیس والوں کے آنے کی وجہ سے وہ تینوں انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے ورنہ فواد کو وہ شاید جان سے ہی مار دیتے۔ اس اوُدھم پٹاخ میں آموں کی تھیلی بھی کہیں غائب ہوگئی تھی اور فواد کا سر اتنا چکرا رہا تھا کہ وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے تو اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے۔ تیورا کر زمین پر گرے تو سر پھٹ گیا اور اس کی وجہ سے ہوش بھی کھو بیٹھے۔

پھر نہ معلوم کون اللہ کا نیک بندہ انہیں ایک نزدیکی کلینک میں لے گیا اور ان کے ساتھ کیا ٹریٹ منٹ کیا گیا۔ جب ہوش آیا تو شام ہو رہی تھی اور سر، کہنی اور گھٹنے پر بینڈیج بندی ہوئی تھی۔ انہوں نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح بیڈ سے اتر کر گھر چل دیں مگر دکھتے ہوئے سر نے اٹھنے کی اجازت ہی دی۔ ویسے بھی جیب میں ایک دمڑی نہیں تھی اور پھوٹا ہوا گھٹنا لے کر پیدل جا نہیں سکتے تھے اور ادھر زریں کی پریشانی کا خیال انہیں بیکل کیے جا رہا تھا وہ چھپ کر نکل جانا چاہتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر انہیں ابھی اجازت نہ دے گا۔ لیکن ڈاکٹر نے اگر فیس اور علاج کے پیسے مانگے تو پھر وہ کہاں سے دیں گے۔ یہ فکر بھی انہیں کھائے جا رہا تھا آخر جب وارڈ بوائے رات کا کھانا لے کر آیا تو وہ نہ معلوم کیونکر اپنے دکھتے ہوئے سر کو تھام کر ہاتھ دھونے کے بہانے اٹھے۔ جنرل وارڈ تھا اور اس کا غسل خانہ وارڈ سے کچھ فاصلے پر ایک کونے میں تھا وارڈ بوائے خود ہی انہیں سہارا دے کر چھوڑ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی فواد نے دور دور تک سناٹا دیکھ کر موقع سے فائدہ اٹھایا اور سب کی نظروں سے بچتے بچاتے کلینک سے نکل آئے آدھا راستہ تو پیدل ہی چل کے طے کیا تھا پھر گدھا گاری والا مل گیا جو غالباً دھوبی تھا۔ اس کی منت سماجت کر کے تھوڑا فاصلہ گدھا گاڑی میں طے کیا اور باقی پیدل چل کر اور یوں انہیں گھر پہنچتے پہنچتے بارہ پونے بارہ بج گئے تھے وہ آہستہ آہستہ چلتے اپنے کمرے میں آئے تو بتی جلانے سے پہلے انہوں نے زریں کو آواز دے کر کہا۔

"زریں۔ زریں جان...... اوہو تو بڑی سنجیدگی سے روٹھ گئیں۔ ورنہ ہمارے بغیر سو تو سکتی ہی نہیں تم۔"

وہ اپنے سر اور گھٹنے کی تکلیف کو ہنسی میں دباتے ہوئے بولے اور پھر بٹن دبا دیا۔ تو کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا۔ مگر زریں بستر پر نظر نہ آئیں۔ انہوں نے مسکرا کر سوچا کہ کہیں چھپ گئی ہوں گی۔ مگر پورا کمرہ چھان مارا اور وہ ملی ہی نہیں انہوں نے پھر انہیں زور زور سے آوازیں بھی دے ڈالیں۔ لیکن اگر زریں گھر میں موجود ہوتیں تو ان کی پکار کا جواب بھی دیتیں

اور تب وہ کچھ کوفت اور کچھ جھنجھلاہٹ میں کمرے سے باہر نکل آئے اور پھر زریں کو آواز دینے لگے مگر جواب پھر بھی نہ ملا۔ سارا گھر بھی پڑا سو رہا تھا۔ پھر بھلا وہ کس سے پوچھتے۔

چپ چاپ خود ہی انہیں سارے گھر میں ڈھونڈتے پھرے اور جب وہ کہیں نظر ہی نہ آئیں تو سیدھے بھاوج کی کمرے میں جا پہنچے جن کا کمرہ اندر کی طرف تھا اور جس کی بتی جل رہی تھی۔ وہ اندر پہنچے تو ناصرہ بیگم پانچ سالہ تیمور کو جو شاید سوتے سوتے جاگ گیا تھا آہستہ آہستہ تھپکتی اپنے چھوٹے بھائی جسے انہوں نے اپنے اکیلے پن کی وجہ سے اپنے ہاں بلا کر رکھ رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ فواد اچانک ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو کچھ ان کا حلیہ اور کچھ تیور دیکھ کر سہم سی اٹھیں۔

''زریں کہاں ہے بھابی جان۔'' انہوں نے جاتے ہی پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم ہوگی یہیں کہیں۔'' ناصرہ بیگم نے بہت ٹرا کر کہا مگر ان کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

''لیکن میں تو اسے سارے گھر میں ڈھونڈ آیا مجھے تو وہ ملی ہی نہیں۔'' وہ ان کے جواب پر کچھ زیادہ ہی پریشان ہو کر بولے۔

''بس تو پھر صبر کر لو اس کی طرف سے بھاگ گئی ہوگی اپنے کسی یار دھگڑے کے ساتھ۔'' ناصرہ بیگم حقارت سے منہ بنا کر بولیں۔ مگر اپنی پریشانی میں انہوں نے بھاوج کے طنز پر کوئی توجہ نہیں دی اور ناصرہ کے بھائی سے پوچھا۔

''کیوں بے تو تو سارے گھر میں چوکڑیاں بھرتا پھرتا ہے کیا تو نے زریں کو نہیں دیکھا۔'' تو احمد علی نے پہلے مسکرا کر بہن پر ایک نظر ڈالی پھر بولا۔

''اسے تو بھول جاؤ فواد بھیا۔ وہ تو ہو گئی ہے پھر۔''

''ابے کیا بکتا ہے بدذات۔ ٹھیک ٹھیک بتا ورنہ تیرا بھیجہ پھاڑ دوں گا۔ سمجھا۔'' فواد دانت پیس کر بولے۔

''ٹھیک ٹھیک کیا بتاؤں کہہ تو دیا کہ وہ چلی گئی کسی کے ساتھ۔ یقین نہیں آتا تو باجی سے پوچھ لو۔'' احمد علی دانت نکال کر بولا۔

''اسے ہاں رنڈی ہی تھی نا آ کرا گر چلی گئی تو تجھے کیوں تعجب ہو رہا ہے۔'' ناصرہ بیگم بڑی نخوت سے بولیں اور ان کا خون کھول اٹھا۔

''زبان سنبھال کر بات کرو بڑی بی۔ جلدی سے بتاؤ زریں کہاں ہے۔'' وہ دانت کچکچا کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولے تو ناصرہ بیگم سہم کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور بھائی سے آہستہ سے کچھ کہا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر باہر جانے لگا تو فواد اس

پر جھپٹ پڑے اور اسے دھکے دے کر کونے میں پھینکتے ہوئے بولے۔

''خبردار جو تو نے یہاں سے جنبش بھی کی۔ ورنہ مار مار کر تیرا ابھر کس نکال دوں گا۔'' اور ابھی ان کے منہ سے بمشکل یہ الفاظ ادا ہی ہوئے تھے کہ ناصرہ بیگم جو اس اثناء میں اپنے تکیے کے نیچے سے بھرا ہوا پستول نکال چکی تھیں ان کا نشانہ لیتی ہوئی بولیں۔

''بھرکس تو میں تیرا نکالوں گی بد بخت نابکار۔ ہونہہ بڑا اوڑا نے دھمکانے آیا ہے' موا جواناں مرگ۔''

اور پھر ناصرہ بیگم چاہتی ہی تھیں کہ ٹریگر دبائیں کہ فواد نے جھپٹ کر تیمور کو گود میں اٹھالیا اور اس کی آڑ لے کر بولے۔

''اگر تم نے گولی چلائی تو میں تیمور کو آگے کر دوں گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم پستول یہاں میرے پاس زمین پر پھینک دو۔''

اور ناصرہ بیگم جو ایسی کسی صورت حال کی بالکل متوقع نہیں تھیں اپنے لخت جگر کو ویوری کی آڑ بنے دیکھ کر ایسی بوکھلائیں کہ فوراً ہی ریوالور ان کے قدموں میں پھینک دیا جسے فوراً ہی فواد نے جھک کر اٹھالیا اور پھر اسے تیمور کی کنپٹی سے لگا کر بولے۔

''اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ زریں کو تم نے کہاں غائب کر دیا ہے۔ ورنہ تھوڑی ہی دیر میں پستول کی گولی تمہارے بیٹے کے پرخچے اڑا دے گی۔'' اور اس دھمکی پر تو ناصرہ بیگم تھر تھر کانپنے لگیں۔

''بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں۔ وہ۔ وہ شیدے کے گھر میں ہے۔'' اور پھر انہوں نے احمد علی سے کہا۔

''جا احمد علی۔ غلامے سے کہنا زرین کو لے کر فوراً یہاں آ جائے باجی بلا رہی ہیں۔''

''نہیں یہ کہیں نہیں جائے گا بڑی بی۔ میں تمہاری ان چالوں کو خوب سمجھتا ہوں ہاں اتنا کر احمد علی ادھر کھڑکی میں منہ ڈال کر بھائی کرم الٰہی کو آواز دے دے کہنا جلدی سے آؤ چھوٹا ملک بلا رہا ہے۔'' فواد نے فوراً ہی بھاوج کی بات رد کر کے احمد علی سے کہا۔ احمد علی بہت ہی خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ بھاگ کر کھڑکی کے پاس آیا اور چیخ چیخ کر کرم الٰہی کو آوازیں دینے لگا حالانکہ احمد علی سترہ اٹھارہ سال کا تھا تھوڑے انتظار کے بعد کرم الٰہی نے کھڑکی کے قریب آ کر پوچھا۔

''خیریت تو ہے کاکے تو مجھے کیوں بلا رہا ہے۔'' اور تب فواد تیمور کو لئے لئے جو اچانک نیند میں خلل پڑ جانے اور دہشت زدہ ہو جانے سے زور زور سے رو رہا تھا کھڑکی کے پاس آ کر بولے۔

''خیریت ہی نہیں ہے بھائی کرم الٰہی ...... تم اتنی مہربانی کرو کہ احسان کو لے کر ذرا شیدے کے ہاں چلے جاؤ کیونکہ یہ ملکانی ہے نا اس کے بھائی تمہاری بھابی کو اغوا کر کے شیدے کے گھر لے گئے ہیں۔ جاؤ بھاگ بھی کرو۔''

اور کرم الٰہ جو جالندھر میں بھی ان کا پڑوسی تھا اور بے حد نیک اور اطوار پرانا شناسا تھا۔ زریں کے اغوا کی خبر سن کر سناٹے میں آ گیا اور پھر یہ کہہ کر اچھا ابھی لے کر آتا ہوں' فوراً ہی چلا گیا۔ پھر جب تک زریں نہ آئیں اس وقت تک

فواد پستول کو تیمور کی کنپٹی پر ٹکائے کھڑے رہے۔

پھر کافی انتظار کرا کلے کرم الٰہی اپنے بھائی احسان کی معیت میں زریں گل کو لے کر آیا تو پستول کو اپنی پتلون کی جیب میں رکھ کر فواد نے تیمور کو پچکار کر اس کے بیڈ پر لٹایا اور پھر زریں کا ہاتھ پکڑ کر جنہیں یہ یقین ہی نہ تھا کہ وہ بدمعاشوں کے چنگل سے نکل کر اپنے شوہر کے پاس پہنچ سکیں گی اور جن کے چہرے کا سارا خون کسی نے سینچ لیا تھا اور جو بری طرح رو رہی تھیں اپنے کمرے میں لے آئے کرم الٰہی بھی ان کے ساتھ ہی کمرے میں آ گیا اور وہ اسے خود پر گزرنے والی روئیداد سنانے لگے۔

اس واقعے کے بعد تو بدائی بھاوج پر سے اعتبار ہی اٹھ چکا تھا اور سب سے بڑھ کر زریں گل کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا اس لیے دوسرے ہی دن وہ زریں گل کو لے کر اپنے پھوپھی زاد پرویز کے یہاں چلے آئے اور انہی کے ذریعہ ان کے ہی محلے میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔

اصل میں تو ان کے امتحان سر پر آ گئے تھے۔ وہ تو وہ شہر بھی چھوڑ دیتے پھر پرویز ہی نے نہیں برادری کے بعض دوسرے لوگوں نے انہیں کتنا اکسایا' کتنا سمجھایا کہ بھائی کے خلاف تادیبی کارروائی کر کے جائیداد سے اپنا حصہ لے لیں مگر ان کا دل ہر شے سے برا ہو گیا تھا۔ انہوں نے لوگوں کے کہنے سننے کے باوجود کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کی۔

امتحانات ختم ہوئے تو وہ زریں کو لے کر ملتان آ گئے۔ آگے پڑھنے کا شوق ہی نہیں بلکہ پکا ارادہ تھا مگر حالات نے اجازت ہی نہ دی۔ اس لیے پڑھائی کا ارادہ ترک کر کے وہ فکر روزگار میں جت گئے۔

ایک روز ایک سرکاری ادارے میں درخواست گزاری کے لیے گئے تھے کہ وہیں ان کی ملاقات اپنے اسکول کے زمانے کے ایک دوست سے ہو گئی۔ اس نے چند ماہ پیشتر ہی ایک کنسٹرکشن کمپنی کھولی تھی۔ ان کے متعلق سنا کہ یہ ملازمت کے لیے سرگرداں ہیں تو انہیں بطور منیجر کے اپنی کمپنی میں ملازمت دے دی۔

ادھر زریں گل نے اپنے پیسے سے دستکاری کا ایک اسکول کھول لیا تھا اور یوں دونوں میاں بیوی کی خوب اچھی گزرنے لگی۔

اور پھر شادی کے پورے تین سال بعد ان کے یہاں اسماء پیدا ہوئی۔ اسماء ہو بہو ماں پر گئی تھی اور ایسی یادوں کے قافلے تھے کہ ماضی کی گرد سے نکل نکل کر فواد کی یادداشت کی سطح پر یکے بعد دیگرے اترتے ہی چلے آ رہے تھے یادیں بھی کیسی تلخ اور شرر ریز تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

زریں کا کہنا درست ہی ہے کہ ہم اسماء کو آخر کیا بتائیں۔ کن الفاظ میں تعارف کرائیں اپنے سگوں کا۔ جبکہ رشتے کی

ڈور کا سرا تو ڈھونڈے نہیں مل رہا اور تعارف کرانا بھی ضروری ہے۔ انہیں اسماء کے آنے کا انتظار تھا لیکن خود ان کی زندگی ان کا انتظار نہ کرسکی۔

جلد از جلد ان کے لیے سوپ کا پیالہ لے کر ان کے پاس آئیں تو وہ ان سے ملے بنا ہی سفر آخرت پر روانہ ہوچکے تھے۔ اور اسماء کو ان ساری باتوں میں سے کسی ایک کا بھی علم نہیں تھا۔ بس اسے تو یہ معلوم تھا کہ بلکہ بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ اس کے کچھ سگے بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔

وہ پلکوں پر شبنمی موتی اٹکائے..... بھیگے بھیگے رخساروں کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں سیپارے لیے دیر سے آنے والی خواتین کو سپارے بانٹتی ہوئی جوں ہی داخلی دروازے پر آئی اس دراز قامت چوڑے چکلے تن و توش کے حامل بے حد ڈیشنگ سے اجنبی نوجوان کو عین دروازے کے بیچوں بیچ دہلیز پر کھڑا دیکھ کر ٹھٹک سی گئی اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر اپیچھے مبادا کہ وہ فاتحہ میں شریک ہونے والی کسی خاتون کی جستجو میں آیا ہو مگر وہاں تو خصوصاً پردہ دار خواتین جو تعداد میں کچھ زیادہ ہی تھیں اسے دیکھ کر ڈسٹرب سی ہوگئی تھیں۔ کسی نے اپنی اجرک میں کود کو چھپا لیا تھا تو کوئی دوپٹے کا گھونگھٹ سا کاڑھ کر بیٹھ گئی تھیں اور بعض ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کررہی تھیں۔ گویا کسی سے بھی اس کا تھوڑا سا تعلق یا واسطہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اس نے جلدی سے پلٹ کر پھر نووارد کی طرف دیکھا۔

اف اشکوں سے جھلملاتی بڑی بڑی جھیلوں کی طرح ساکن سی نگاہیں۔

جن میں حیرت اور تجسس بھی۔

حسین تر کتابی چہرے پر سوگواری کے ساتھ ساتھ ایک حجاب آمیز تاثر بھی۔

خوب صورت' مگر' سرو قد اور شہابی رنگت۔

کچھ دیر تو آنے والا پلک جھپکانا ہی بھول گیا۔

اور اس کے دیکھنے کے اس بے باکانہ سے انداز پر اس نے پلکیں جھکا کر پوچھنا چاہا۔

''آپ......آپ۔''

''جی مجھے تیمور جواد کہتے ہیں۔'' وہ بدستور اسے ایک ٹک دیکھتا ہوا اس کی بات کاٹ کر بولا۔ تو اس نے بری طرح چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سخت اچنبھے کے عالم میں بولی۔

''تیمور جواد کیا آپ آپ تایا جی کے۔''

''ہاں جی قسمت' سے میں آپ کے تایا جی کا ہی فرزند ارجمند ہوں۔'' اس نے پھر اس کی بات کاٹ کر جس طرح

اس کا فقرہ پورا کیا اس کے سوگوار سے چہرے پر مسکراہٹ سی دوڑ گئی جسے دل سے چھپانے کی غرض سے اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ تو پھر آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں آیئے لاؤنج میں چل کر بیٹھیے جہاں مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔''

''لیکن میں مردوں یا عورتوں کے پاس بیٹھنے تو نہیں آیا میں تو صرف مرحومہ چاچی کی تعزیت کرنے آیا ہوں گو بہت لیٹ کنڈولینس ہے مگر۔''

''خیر...... خیر...... نیور مائنڈ...... سب کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں...... آپ آج ایک سال بعد ہی سہی لیکن آ تو گئے نا......'' اس نے اس کے انداز تکلم کا ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیا بلکہ بڑی فراخدلی سے بولی۔

وہ ہنوز اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا اور وہ اسماء کے پیچھے ہال میں بیٹھی ہوئی خواتین کی نظروں کی زد میں بھی تھا۔ کچھ اس خیال سے بھی وہ بری طرح سٹپٹا رہی تھی اور کچھ خواتین کی بے پردگی کے خیال سے بھی۔

اور پھر کسی کو بھی تو معلوم نہ تھا کہ وہ اجنبی شخص کون ہے۔

''آیئے آپ چل کر تھوڑی دیر بیٹھیں تو سہی آج ای جی کی برسی ہے نا بس قرآن خوانی کے فوراً ہی بعد فاتحہ ہوگی آپ اس میں تو شریک ہوں گے نا۔''

''اوہ ہاں...... ضرور شریک ہوں گا مگر کہاں جا کر بیٹھنا ہوگا۔'' اس نے عجیب از خود رفتہ سے انداز میں پوچھا تو وہ ایسی گڑبڑائی کہ سپارے ہاتھ میں لیے لیے جلدی سے اس کے پہلو سے نکل کر باہر آ گئی اور تیزی سے بیرونی لاؤنج کی طرف بڑھتی چلی گئی جہاں مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ لاؤنج کے اندر کے بجائے اس نے دروازے پر ہی رک کر پیچھے دیکھا۔ وہ اس کے اس قدر قریب کھڑا ہوا تھا کہ وہ اگر احتیاط نہ برتتی تو یقیناً بری طرح اس سے ٹکرا جاتی۔

''آپ اندر چلے جایئے میں ابھی ملازم کے ہاتھ آپ کے لیے چائے بھجواتی ہوں۔'' تیز تر دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش میں اس نے کہا کہ ایسی صورت حال سے تو کبھی وہ دوچار ہی نہ ہوئی تھی۔

''لیکن میں اندر بیٹھنے والوں سے واقف ہی نہیں ہوں تو پھر وہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔ ویسے بھی میں تو آپ کی تعزیت دینے اور آپ سے ملنے کی غرض سے آیا ہوں۔'' وہ وارفتہ سے انداز میں اس کی طرف تھوڑا سا جھک کر بولا تو اس نے پیچھے سرک کر تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''وہ...... وہ تو ٹھیک ہے لیکن...... لیکن اس وقت تو قرآن خوانی ہو رہی ہے نا...... میرا مطلب ہے صرف ڈیڑھ دو گھنٹے کا ہی تو معاملہ ہے۔ پلیز اتنی دیر آپ اندر جا کر بیٹھیں۔'' تو جواب میں تیمور نے تھوڑا سا توقف کر کے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے کوشش کروں گا کہ وہاں بیٹھ سکوں۔'' اور پھر مزید کچھ کہے یا سنے بغیر تیزی سے لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ اور وہ اسے لاؤنج میں چھوڑ کر ہال میں واپس آئی تو اپنے فرسٹ کزن کی یوں آمد پر اپنا سارا رنج و ملال بھول کر اتنی خوش خوش نظر آ رہی تھی کہ اس کی سہیلی طیبہ نے بڑے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''بھئی یہ آخر کون تھا اتنا ڈیشنگ سا جسے دیکھ کر تم اتنی خوش نظر آ رہی ہو۔''

''وہ میرا فرسٹ کزن ملک تیمور جواد ہے اور میں آج پہلی بار اس سے ملی ہوں۔'' اس نے طیبہ کی بات کا نوٹس لیے بغیر بتایا۔

''مگر تمہارا تو کوئی رشتے کنبے دار سرے سے ہے ہی نہیں پھر یہ ایک دم ہی اتنا اسمارٹ سا پلا پلایا کزن کہاں سے پیدا ہو گیا۔'' اسماء کے پڑوس میں رہنے والی ایک سہیلی نادیہ نے تمسخرانہ سے انداز میں پوچھا۔ اسماء اس کے ٹانٹ کو سمجھ تو گئی مگر برا مانے بغیر بولی۔

''نہیں...... میرے تایا، تائی اور ان کے بچے بھی موجود ہیں اور یہ ملک تیمور تایا جی کے سب سے بڑے بیٹے ہیں۔''

''اے تو یہ تمہارے تایا تائی اور ان کے بچے اب تک کہاں رچ بس رہے تھے جو ان میں سے کوئی تمہارے ابو کے انتقال کے موقع پر آیا نہ امی کے۔''

ایک اور پڑوسن نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو اسماء سٹ پٹا سی گئی...... اب ان سے کیا کہتی کہ آپس میں میل جول بند تھا اس لیے نہیں آئے تھے۔ وہ تو آنٹی صفیہ نے جواب اس کی سرپرست تھی جلدی سے بات بنا دی۔

''یہ لوگ تو عرصے سے افریقہ میں رہائش پذیر تھے پھر بھلا کیونکر آ سکتے تھے اس وقت۔''

''جی ہاں یہ تو ابھی چند دن قبل ہی پاکستان آئے ہیں۔'' آنٹی صفیہ کی بات سے اسے کچھ حوصلہ ملا تو وہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی۔

''اے رفعت بہن کیا آپ کو یاد نہیں اس کے تایا تو پچھلے سال یہاں آئے تھے۔'' آنٹی صفیہ نے کہا۔

''خیر ہمیں اس سے کیا مگر تمہارے تایا زاد کو نہیں تو کم از کم تمہیں تو ہماری بے پردگی کا خیال رکھنا چاہیے تھا اسماء۔'' ایک اور صاحبہ بولیں جو ایک قریبی محلے میں رہتی تھیں اور پردے کے سختی سے پابند تھیں۔

''آہو وئی عجب بندہ ہے جو منہ اٹھائے زنانیاں وچ وڑ آیا۔'' ایک اور صاحبہ نے منہ بنا کر پہلی کی تائید کی۔

''جی آنٹی میں آپ لوگوں سے سخت شرمندہ ہوں...... اصل میں انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ کدھر جانا ہے رفیقے نے انہیں بتایا ہی نہ ہوگا۔'' سب کی ملامت سے گھبرا کر اسماء معذرتی لہجے میں بولی۔

"مگر اسماء ان بیچارے نے تو کسی کی طرف دیکھا ہی نہیں پھر ان لوگوں کی بے پردگی کیسے ہوگئی۔" طیبہ نے اسماء کے معذرت کرنے پر قدرے چڑ کر کہا۔

"اے لو...... دیکھا نہیں تو کیا ہوا انسان کی نظر تو پڑ ہی جاتی ہے آپ ہی آپ۔" وہی پردہ نشین خاتون چمک کر بولیں اور طیبہ جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ آنٹی صفیہ نے پوچھا۔

"اب کتنے سپارے اور باقی رہ گئی ہیں پڑھنے کے لیے۔"

"بس دو تین ہی باقی رہ گئے ہیں آنٹی۔" نادیہ نے جواب دیا۔

"تو لاؤ یہ دونوں سپارے میں پڑھ لیتی ہوں کیونکہ یہ سب تو ابھی پڑھ ہی رہی ہیں۔" اسماء بولی۔

"نہیں تم رہنے دو...... یہ دونوں سپارے میں اور عائشہ ابھی پڑھ لیں گے۔ تم جا کر ذرا رفیقے سے یہ معلوم کراؤ کہ مردانے کا کیا حال ہے۔ کیا وہاں ختم پورا ہو چکا یا ابھی کچھ کسر باقی ہے۔" آنٹی صفیہ نے کہا اور اسماء کو ایسا محسوس ہوا کہ آنٹی صفیہ نے یہ کہہ کر اس کی کوئی دلی مراد پوری کردی ہو کیونکہ وہ خود بھی باہر جانا چاہ رہی تھی تاکہ رفیقے سے کہہ کر تیمور کو چائے بھجوائے۔ وہ اٹھ کر جانے لگی تو طیبہ نے پھر اسے چھیڑا۔

"اوہو ابھی کچھ دیر پہلے تو مردانے تک جانے کے خیال سے ہی بدک رہی تھیں اور اب کیسے بھاگ کر جا رہی ہو...... بھئی معاملہ تو ٹھیک ہے نا۔" تو اس نے جاتے جاتے طیبہ کو گھور کر دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"لیکن میں وہاں تو نہیں جا رہی...... میں تو رفیقے کے ہاتھ ان کو چائے بھجوانے جا رہی ہوں۔"

"اوہو ان کو۔" طیبہ شوخ سے انداز میں ہنسی۔

"اچھا زیادہ بکواس نہ کرو۔" وہ جھینپ کر بولی اور پھر ہال سے باہر نکل آئی۔

اس سے اس کا دل تو بہت چاہا کہ پہلے لاؤنج کا ہی رخ کرے مگر وہاں دوسرے مردوں کی موجودگی میں تاک جھانک کر یہ دیکھنا کہ اس کا کزن کیا کر رہا ہے اسے بالکل مناسب نہ لگا اس لیے وہ سیدھی اپنے گھر کے عقب سمت آگئی جہاں کچھ زمین میں پتھروں سے بنائے گئے عارضی چولہوں پر دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور مرغن اور اعلیٰ قسم کے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو بھوک اور پیٹ کے درمیان ایک جذباتی کھچاؤ سا پیدا کر رہی تھی۔ اور جہاں رفیقے کی موجودگی کے امکانات بہت یقینی تھے۔ کیونکہ وہ گھر کا پرانا اور واحد ملازم تھا اور کھانا پکانے سے لے کر سودا سلف لانے اور گھر کی صفائی ستھرائی کرنے کے کاموں پر مامور تھا۔

مگر رفیقے اسے درمیان میں ہی مل گیا۔

تو وہ اسے مردانے میں جا کر ختم قرآن کے بارے میں پوچھ کر آنے کے ساتھ ساتھ نئے مہمان کے لیے چائے لے جانے کی ہدایت کر کے فوراً ہی ہال میں واپس آ گئی۔

''دیکھ آئیں اسے۔'' طیبہ نے پھر چھیڑا۔

''فضول باتیں نہ کرو میں تو ادھر گئی بھی نہیں۔'' وہ چڑ کر بولی اور پھر آنٹی صفیہ کو مخاطب کر کے کہا۔

''آنٹی میں نے رفیقے کو مردانے میں بھیج دیا ہے۔ فاتحہ تو مردانے میں ہی ہو گی نا۔''

''ہاں۔ اسی لیے تو پچھوایا ہے کہ ہم سب بھی اس وقت اگلے کمرے میں چلے جائیں گے۔'' آنٹی صفیہ نے کہا۔ ان کے آگے ہی ایک تپائی پر وہ دونوں آخری سپارے رکھے تھے جو اب تک پڑھے نہیں گئے تھے۔ اسماء نے بڑھ کر خود ہی ان میں سے ۲۹ واں پارہ اٹھا لیا اور وہیں بیٹھ کر پڑھنے لگی مگر ابھی دو تین صفحے ہی پڑھ سکی تھی کہ رفیقے نے ہال کے دروازے پر آ کر اسے آواز دی تو وہ سپارہ تپائی پر رکھ کر دروازے پر پہنچی۔

''بی بی ادھر مردانے میں تو قرآن شریف پڑھایا جا چکا ہے۔ اب قدیر صاحب نے بولا ہے کہ بیگم صفیہ اگر اجازت دیں تو فاتحہ پڑھ لی جائے۔''

''انکل سے کہنا ابھی ادھر دو پارے اور باقی رہ گئے ہیں اتنے میں وہ چنوں اور کشمش پر تھوڑا کلمہ اور پڑھوا لیں پھر فاتحہ خوانی بھی ہو جائے گی۔'' اسماء نے کہا۔

''اچھا بی بی۔'' رفیقے اتنا کہہ جانے لگا تو اس نے ذرا آگے بڑھ کر اسے پکارا۔

''او رفیقے کاکا! سنو۔ کیا چھوٹے ملک کو چائے دے آئے۔''

''کون چھوٹا ملک۔'' رفیقے نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔

''ارے وہی جو ابھی دس پندرہ منٹ پہلے یہاں آئے تھے۔ کیا تم نے انہیں نہیں دیکھا تھا...... وہ تایا جی کے بڑے بیٹے۔''

''نہیں۔ میں نے تو ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی بی بی۔''

''تو اس کا مطلب ہے تم چائے لے کر بھی نہیں گئے ان کے لیے۔'' اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔

''نئی جی آپ حکم دیں اور میں نہ کروں...... میں تو چائے لے کر گیا تھا ادھر پر مجھے تو وہاں کوئی بھی نئی صورت نظر نہیں آئی ہاں تب (البتہ) وہ قدیر صاحب کچھ کہہ تو رہے تھے کہ ایک بندہ آیا تھا بغیر کچھ پڑھے چلا بھی گیا۔'' رفیقے نے کہا تو اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا تو تیمور آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ مگر وہ کیوں آئے تھے آخر اتار نے یا مجھ پر احسان رکھنے

کیا ضرورت تھی آنے کی۔ اب ان لوگوں کو معلوم ہوگا تو بھلا وہ کیا سوچیں گے کہ میرا تایا زاد آیا بھی اور چلا بھی گیا۔ نہ معلوم کیا سمجھیں کہ میں نے خوامخواہ ایک انجان اور اجنبی خوب صورت سے شخص کو اپنا کزن بنا کر پیش کر دیا۔ ان لوگوں کے ذہن تو پہلے ہی اتنے پست ہیں۔ اس نے سراسیمگی کے عالم میں دل میں سوچا۔ رفیقے چلا گیا تھا وہ پلٹ کر اندر آئی تو اس کی پڑوسن رفعت نے بڑے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''لو بھئی آئے بھی وہ گئے بھی ختم فسانہ ہوگیا۔'' اور اسے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ انہوں نے رفیقے کی پھٹی پھٹی آواز سن لی ہے۔

''ہیں کیا مطلب۔'' ایک اور صاحبہ نے تجاہل سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

''ارے بھائی وہ جوان کا تایا زاد آیا تھا نہ ابھی ابھی وہ جس طرح چپکے سے آیا تھا اسی طرح چپکے سے کھسک بھی گیا ہے۔'' وہی خاتون بولیں جنہوں نے پردہ نشین خاتون کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''اے وہ تمہارا تایا زاد ہی تھا یا کوئی فراڈ۔ آج کل تو بڑا اندھیر مچا ہوا ہے۔ خوب صورت لڑکے طرح طرح کے فراڈ کر کے لوگوں کو دھوکا دے دیتے ہیں۔'' ایک اور پڑوسن بیگم رضوان بولیں۔

''اب مجھے کیا خبر انہوں نے تو میرے تایا کا نام لے کر اپنا تعارف کرایا تھا۔ اب مجھے کیا معلوم کہ وہ میرا تایا زاد تھا یا کوئی فراڈ۔'' اسماء نے سب کی رکیک باتوں پر جل کر بولی۔

''بھئی تایا زاد ہی ہوگا ورنہ یوں جوتیوں سمیت تو کوئی آنکھوں میں گھسنے کی کوشش نہیں کرتا۔'' آنٹی صفیہ نے اسماء کو محض ان خواتین کی بے جا قیاس آرائیوں سے بچانے کی غرض سے کہا...... ورنہ دل میں وہ بھی یہی سوچ رہی تھیں کہ نو وارد کوئی فراڈ ہی نہ ہو۔

''لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کوئی فراڈ ہی ہو اور اسماء کی کسی کمزوری سے واقف ہو۔'' رفعت نے کہا جو پڑوسیوں کی کمزوریوں اور خامیوں کو ٹٹولنے کی عادی تھیں اور ان کی بات پر اس اتنی سوگوار محفل میں بھی ایک قہقہہ گونج اٹھا اور اسماء بیچاری کا منہ اتر کر رہ گیا۔

''بھئی تم ان فضول قیاس آرائیوں کی پرواہ کیوں کرتی ہو اسماء...... وہ اگر کوئی فراڈ بھی تھا تو خود ہی آیا اور چلا بھی گیا۔ کوئی تم نے تو اسے نہیں بلایا یا بھگایا...... خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا دینا تو بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔'' طیبہ اپنی اتنی پیاری سہیلی کی اتری اتری سی شکل دیکھ کر دردمندی سے بولی۔ وہ بڑی چالاک تھی۔ براہ راست بڑوں کو مخاطب کر کے نہیں کہتی تھی بلکہ اسماء کو ذریعہ بنا کر کہتی تھی۔ اسی خیال سے اسماء کو بھی ہنسی آ گئی۔

اعتراضات کرنے والی خواتین کچھ تو طیبہ کی بات پر اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں کچھ صفیہ نے طیبہ کی تائید میں کہا۔

''ہمارے ساتھ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ ہم اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے بلکہ دوسروں کی عیب جوئی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ تک نہیں دیکھتے کہ میلاد کی محفل ہے' خوشی کی یا غمی کی...... بس فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے رہتے ہیں...... چلو بیٹی طیبہ اسماء اور تم مل کر یہ دونوں پارے بھی جلدی سے ختم کر لو فاتحہ خوانی کے بعد پھر کھانے پینے کے جھنجھٹ سے بھی تو نمٹنا ہے۔'' اور یوں بھرپوری محفل پر سناٹا چھا گیا اور جو خواتین ابھی تک سپارے پڑ رہی تھیں وہ پھر سپاروں کی طرف متوجہ ہو گئیں لیکن صفیہ بیگم کو اب بھی ان کی ذہنیتوں پر کوفت ہو رہی تھی۔

''ہونہہ! خدا کا پاک کلام ہاتھ میں لے کر فضول باتیں کرنا۔''

''بہنوں برا نہ مانئے گا یہ دنیا تو ہمارے اعمالوں کی کسوٹی ہے یہاں پر اٹھنے والا ہر قدم گناہوں کی ولدل سے ہو کر گزرتا ہے۔ بس تھوڑی سی احتیاط کی ضرورت ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم دنیادار لوگ ہیں اور ہمیں ہر طرح کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے قلوب کو صاف اور فراخ رکھیں اور خداوند قدوس کی خوشنودی کو مقدم تو بہت سے گناہوں سے بچ تو سکتے ہیں۔'' صفیہ بیگم نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''اوہو! شاید آنٹی صفیہ کو ہمارا ہنسنا بہت ناگوار گزرا ہے۔'' رفعت کی بیٹی نادیہ نے ہنس کر کہا۔

''نہیں بیٹی ہنسنا یا رونا تو غیر اختیاری عمل ہے بھلا مجھے کیوں ناگوار گزرنے لگا البتہ کسی کی دل آزاری یا عیب جوئی ایسا قبیح فعل ہے کہ جس کی معافی اور تلافی ممکن ہی نہیں اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ کیا تم اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرو گے اور افسوس تو اس بات پر ہے کہ یہ عیب زیادہ تر خواتین میں ہی پایا جاتا ہے۔ خوشی کی' غمی کی محفل ہو یا اللہ رسول کی خواتین عام طور پر دوسرے کی غیبت یا عیب جوئی میں ہی مصروف نظر آتی ہیں اس پر ستم یہ کہ ادھر بیٹھ مڑی اور ادھر برا بھلا کہنا شروع کر دیا بہنوں کھلی منافقت ہوتی ہے یہ تو گویا دوہرا گناہ...... توبہ توبہ خدا معاف کرے۔'' صفیہ بیگم نے کچھ نرمی اور کچھ تلخی سے کہا۔

''ہاں! اور اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ جو لوگ دوسروں کو ایسی نصیحتیں کرتے نظر آتے ہیں وہی سب سے زیادہ ایسے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔'' رفعت طنز کرتی ہوئی بولیں۔

''ہاں چونکہ انسان فرشتہ نہیں بلکہ غلطیوں اور خطاؤں کا پتلا ہوتا ہے ہزار احتیاطوں کے باوجود بھی اس سے بہت سی خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں لیکن رفعت بہن! اچھا نائب ہونے کی حیثیت سے خدا نے بندے کو یہ اختیار تو ضرور دیا ہے کہ وہ نیک اور بد میں تمیز کر سکے اور جس راہ کو چاہے اپنا لے اور میں کوشش تو یہی کرتی ہوں کہ نیک راہ پر چلتی رہوں اس کے

باوجود بھی اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اس کو آپ بھی بخوبی محسوس کر سکتی ہیں کیونکہ انسان کو خود اپنی خامیاں تو کبھی نظر ہی نہیں آتیں۔'' صفیہ بیگم نے رفعت کو ایسا کھرا جواب دیا کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

''چلو خیر...... صفیہ بہن نے تو بہشت میں زمرد کا محل کھڑا کر ہی لیا اپنے لیے۔'' پردہ نشین خاتون نے اپنا سپارہ ختم کر کے اسے تپائی پر رکھتے ہوئے بہت ہنس کر کہا۔

''ارے بی بی! میں بہت ناچیز اور گناہگار ہستی ہوں خدا کرے آپ کی دعائیں مستجاب ہو جائیں اور مجھے بہشت میں زمرد کا محل نہ سہی ایک چھوٹا سا گھاس پھونس کا جھونپڑا ہی نصیب ہو جائے۔'' صفیہ بیگم دل گیر سے لہجے میں بولیں۔

''اصل میں تو آنٹی لوگوں نے خوامخواہ ہی مذہب کو ہوا بنا کر رکھ دیا ہے۔ میرا مطلب ہے لوگ ہر بات میں مذہب کو بیچ میں لے آتے ہیں کہ یہ نہ کرو وہ نہ کرو اس میں گناہ ہوگا اس میں ثواب ہوگا جب کہ عملی زندگی سے مذہب کا اتنا گہرا تعلق بھی نہیں ہے کیونکہ حالات سے مجبور ہو کر زندگی بنانے اور سنوارنے کے لیے بہت سے ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔'' ایک لڑکی طاہرہ بولی جو بہت ایڈوانس تھی اور اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔

''نہیں طاہرہ...... ہمارا مذہب تو اس قدر سیدھا سادا اور آسان ہے جیسے کوئی سیدھا اور متوازی راستہ جس میں کوئی نشیب و فراز ہو نہ ٹیڑھ اور نہ کوئی موڑ توڑ...... جو اپنی ہمواری کے ساتھ سیدھا منزل پر جا کر ہضم ہوتا ہے۔'' صفیہ نے بہت دھیرے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''مگر صرف ان کے لیے جو منزل تک پہنچنے کے شیدائی ہوں ورنہ وہ لوگ تو مذہب کے ہوا ہی سمجھتے ہیں جنہیں منزل تک پہنچنے کی جستجو نہیں ہوتی رہا عملی زندگی کا سوال تو ہماری زندگی کا تمام تر نظام ہمارے مذہب کے اعلیٰ و ارفع اور آفاقی اصولوں اور ضابطوں پر ہی قائم ہے۔ یعنی ہمارا اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا' سونا جاگنا' کھانا پینا' ہنسنا بولنا حتیٰ کہ سانس تک لینا بھی مذہب ہی سے وابستہ ہے۔ اب رہ گیا جائز یا ناجائز یا گناہ اور ثواب کا سوال تو میں تم کو صرف ایک نصیحت کروں گی کہ تم ہر بات اور ہر معاملے میں خدائی خوشنودی اور خوف کو مقدم رکھو گی تو پھر تمہیں خود ہی اپنے اس سوال کو سمجھنے کا شعور آ جائے گا کہ زندگی بنانے اور سنوارنے کے لیے یا حالات سے مجبور ہو کر انسان کو بہت سے ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جو مذہبی نقطہ نظر سے صریحاً ناجائز اور غیر مناسب ہوتے ہیں۔

''اوہو! آنٹی صفیہ کو تو انڈسٹریل ہوم کی مالکہ نہیں کسی تدریسی مجلّے کی مبلغہ ہونا چاہیے تھا۔'' نادیہ نے استہزاً طاہرہ کے کان میں کہا۔

اور تبھی رفیقے نے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اطلاع دی۔

"وہ جی بیگم صفیہ صاحب سے کہنا کہ بس پانچ منٹ اور ٹھہر جائیں یہاں بھی قرآن شریف ختم ہی ہونے والا ہے۔"
صفیہ بیگم نے کہا۔

"اچھا جی پر جلدی کریں ادھر سب لوگ جلدی کر رہے ہیں۔" رفیقے نے کہا اور پھر چلا گیا۔ تو جن خواتین کے تھوڑے تھوڑے پارے باقی رہ گئے تھے وہ بھی جلدی جلدی پڑھنے لگیں...... پھر تھوڑی دیر بعد قرآن پاک ختم کر کے ساری خواتین لاؤنج کے برابر والے کمرے میں چلی آئیں اور پھر فاتحہ خوانی کے بعد مردانے اور زنانے میں بیک وقت دسترخوان بھجوا دیئے گئے اور کھانے کے دوران بھی صفیہ بیگم، طیبہ اور اسماء نے دیکھا کہ ساری خواتین آپس میں کھسر پھسر کر رہی ہیں۔

"بس ان لوگوں کے ہاتھ تو کوئی بات آنی شرط ہے پھر تو یہ اسے اس طرح طشت از بام کرتی ہیں کہ شیطان بھی ان سے پناہ مانگنے لگتا ہوگا۔" سب کے جانے کے بعد صفیہ بیگم نے اسماء سے کہا۔

"جی ہاں آنٹی۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ آپ کے اتنے سمجھانے بجھانے کے باوجود دسترخوان پر بھی یہ سب چہ میگوئیوں سے باز نہیں آئیں۔" اسماء نے کہا۔

اس کا انداز بجھا بجھا سا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے فاتحہ خوانی کے وقت ماں اور باپ کو یاد کر کے روتی بھی بہت تھی مگر صفیہ بیگم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ بہت حساس لڑکی ہے اور تیمور کے اچانک نمودار اور غائب ہو جانے پر مہمان خواتین کے طنزیہ فقروں کا اس نے بہت اثر لیا تھا۔ وہ تھوڑے سے توقف کے بعد بولیں۔

"یہ بات تو میرے دل کو کھٹک رہی ہے بیٹی کہ۔"

"کہ وہ تیمور نہیں کوئی اور تھا۔" اسماء نے ذرا تلخی سے ان کا فقرہ پورا کیا۔

"ہاں۔"

"مگر وہ آخر کون ہو سکتا تھا آنٹی...... بھلا کس کو پڑی تھی مجھ سے ایسا فضول سا مذاق کرنے کی جب کہ میں کسی کو جانتی تک نہیں۔" اسماء نے ٹھہرے انداز میں کہا۔

"ہاں ہاں وہ تو میں بھی جانتی ہوں بیٹی...... بلکہ سبھی جانتے ہیں کہ تم اس قسم کی بچی نہیں ہو مگر آخر تک کیا تھی اس شخص کے آنے کی۔ خود میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔" صفیہ بیگم نے اپنا دماغ لڑاتے ہوئی کہا۔ اسماء ہی نہیں وہ خود بھی صبح سے کام کرتے کرتے بری طرح تھک گئی تھیں۔ اس پر دوپہر کے تین بج چکے تھے اس لیے انہوں نے فوراً بات پلٹ کر اسماء کو آرام کرنے کی ہدایت کی اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئیں اور غم سے نڈھال اور تھکن سے چور اسماء کو لیٹنے کے

باوجود بھی چین نہیں آیا۔ اس کا الجھا ہوا دماغ بری طرح الجھتا ہی چلا گیا۔

اس کے ابو نے تو اسے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ ساری زندگی چھپائے ہی رکھا اور جب ایک دن بہت چپکے سے اسے اور اس کی امی کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے تو کافی دنوں بعد جب اس کی امی کے پاس اس کے تایا کا تعزیتی اور معذرتی خط آیا تب اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کا بھی اس کے ابو اور امی کے علاوہ دنیا میں کوئی سگا موجود ہے اور تبھی اس کی امی نے اسے بتایا تھا کہ چونکہ وہ غیر خاندان سے تھی اس لیے ان کی جیٹھانی کا ان سے مزاج نہیں ملا تھا لہٰذا آئے دن کیک چیخ چیخ اور کل کل سے تنگ آ کر اس کے ابو نے یہی بہتر سمجھا کہ نگاہ بدلنے سے بہتر ہے کہ توجہ ہی بدل دیں اور پھر الٹا گھر ہی نہیں شہر بھی چھوڑ کر ملتان جانے کا قصد کیا کہ ملتان میں انہیں روزگار ملنے کی امید تھی۔ تو بڑے بھائی نے جو نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کا گھر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر چلے جائیں۔ اس بات پر بڑی لے دے مچائی اور نتیجتاً دونوں آپس میں ترک تعلق کر بیٹھے۔ اصل میں تو جیٹھانی بڑی دبنگ قسم کی خاتون تھیں۔ میاں کو انہوں نے مٹھی میں لے رکھا تھا۔ انہیں کا سکہ سارے گھر میں چلتا تھا' میاں بھی ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ میں ان کی دیورانی تھی اور پھر غیر خاندانی اس لیے وہ ہمیشہ مجھ پر حاوی رہنے اور مجھے دبانے میں کوشاں رہتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تمہارے ابو نے اپنی پسند سے مجھ سے شادی کی تھی جب کہ جیٹھانی کی شروع سے یہ خواہش تھی کہ وہ تمہارے ابو کی اپنی بھانجی سے شادی کریں بس اسی لیے تمہاری تائی ساری کسر مجھ سے نکالتی تھیں اور وہ تو مجھے' تمہارے ابو سے طلاق تک دلوانے کے درپے تھیں اور اسی وجہ سے میری جان کی لاگو ہو گئی تھیں اور ان کے خطرناک ارادوں کو بھانپ کر ہی تمہارے ابو قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اور ان کا گھر چھوڑ کر یہاں ملتان آ گئے تھے۔ شروع شروع میں تو چند ماہ تک تمہارے ابو کو بیروزگاری کی وجہ سے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر پھر ان کے ایک دیرینہ دوست نے انہیں اپنی اس کنسٹرکشن کمپنی میں منیجر کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا تھا مگر وہ کمپنی بھی صرف تین سال تک ہی چل سکی تھی۔ پھر تمہارے ابو کی ملازمت چھوٹی تو وہ کافی عرصے تک بیروزگار رہے مگر بیروزگاری کے عالم میں بھی وہ خالی نہیں بیٹھے بلکہ واقف کاروں سے کہہ کر چند ٹیوشنز بھی لگا لیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی۔ اکنامکس میں ایم اے کرنے کے بعد ہیں جا کر انہیں اس کالج میں لیکچرار کی جگہ مل گئی۔ اس دوران میں ہماری گھر کے سونے آنگن میں تم اپنے ننھے منے وجود کے ساتھ رونق بڑھانے آ چکی تھیں۔ تمہارے ابو کی تنخواہ بہت قلیل تھی۔ اس کے باوجود بھی ہم نے بڑے ناز و نعم سے تمہاری پرورش کی۔ تمہیں پڑھایا لکھوایا اور تمہارے لیے یہ چھوٹا سا بنگلہ بھی بنوا دیا۔ اور اس طرح کہ گومت کی طرف سے اساتذہ کو زمینیں الاٹ ہوئی تو تمہارے ابو کو بھی یہ پلاٹ مل گیا تھا۔ بہرحال وہ تو جو ہونا تھا رفت گزشت لیکن یہ دیکھو تمہارے تایا ابو نے کیسا درد بھرا خط لکھا ہے

اور کس کس طریق پر اپنی زیادتیوں اور کوتاہیوں پر معذرت کی ہے۔ تمام حقیقت سے آگاہ کرنے کے بعد زریں گل نے ملک جواد کا خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑی آزردگی سے کہا۔

''میں کیا کروں گی اسے پڑھ کر...... جب کہ ان کی شکل دیکھنی تو کجا ان کے بارے میں سنا بھی آج ہے۔'' اسماء بیزاری سے بولی۔

''ہاں اس بات کا تو مجھے بھی سخت قلق ہے بیٹی! کہ اس روز جس دن تمہارے ابو رخت سفر باندھ رہے تھے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ساری بات تم کو بتا دیں گے مگر افسوس کہ موت نے انہیں مہلت ہی نہیں دی ورنہ وہ تو کالج سے تمہاری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔'' اپنی بات کہتے کہتے زریں گل کی آواز بھرا گئی۔

''ہونہہ! ابو بیچارے تو تھے ہی فطرتاً صاف اور فراخ دل لیکن اگر وہ مجھے بتا بھی دیتے تو فائدہ بھی کیا ہوتا امی جی! آپ چاہتی ہیں کہ آپ نے تار کے ذریعے ابو کے انتقال کی اطلاع بھی بھیجی تھی اس کے باوجود بھی بڑے بھائی صاحب نہیں پلٹے۔'' اسماء چمک کر بولی۔

''ہاں مگر انہیں وہ تار ملا ہی نہیں تو پھر وہ کیونکر آتے۔ ہوسکتا ہے تار بھیجنے والے نے غلط پتا لکھوا دیا ہو۔'' زریں گل نے کہا۔

''ہونہہ تار نہیں بھی ملا تھا تو کیا یہ ملک جواد صاحب صرف اسی انتظار میں تھے کہ ابو مریں تو یہ ہمیں تعزیت کا خط لکھیں۔ ایسے ہی اپنے کیے پر نادم ہیں تو ابو کی زندگی میں ہی ان سے ملنے کیوں نہ آ گئے۔'' اسماء بے حد تلخ سے لہجے میں بولی۔

''نہیں کوشش تو انہوں نے بہت کی تھی کہ تمہارے ابو کی زندگی میں تعلقات استوار کرنے کی لیکن تمہارے ابو نے ہی پسند نہیں کیا تھا۔ مگر اپنی زندگی کے آخری ایام میں ان کے خیالات بدل گئے تھے اور ان کی یہی خواہش تھی کہ کسی طرح بھائی کو اپنے پاس بلا لیں یا خود جا کر ان سے مل آئیں مگر بے چارے یہ آرزو دل کی دل میں ہی لیے رخصت ہو گئے۔'' زریں گل نے بتایا تو اسماء چپ سی ہو گئی۔

''دیکھو بیٹی! وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے احساسات اور خیالات بھی بدلتے رہتے ہیں کیونکہ وقت کی گردش، تجربات اور مشاہدات انسان کو کبھی نہ کبھی اس کی غلط کاریوں کا احساس ضرور دلا دیتے ہیں تبھی تو تمہارے تایا اپنے کیے پر سخت نادم اور پریشان ہیں اور ندامت اور پچھتاوے کا احساس جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو ضمیر خلش بن جاتا ہے اور ضمیر کی خلش انسان کے لیے کسی سزا سے کم نہیں ہوتی۔ بہت ممکن ہے کہ اسی وجہ سے بھائی جان کو یہاں آنے کا حوصلہ نہ پڑا ہو تبھی تو انہوں نے ہمیں کس محبت سے اپنے پاس بلایا ہے۔'' زریں گل بیٹی کو خاموش دیکھ کر پھر بولی۔

''افوہ! آپ تو اپنی فطرت کی وجہ سے کہ آپ کا دل آئینے کی طرح صاف اور شفاف رہتا ہے۔ان کی محبت کے دو بول پڑھ کر ساری رنجش ہی بھلا بیٹھی امی جی۔مگر کم از کم میرے لیے تو یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ میں ان کے یہاں جانے کا سوچوں۔'' اسماء قدرے تنک کر بولی۔

''خیران کے یہاں جا کر رہنے کے حق میں تو میں بھی نہیں ہوں کہ اپنا گھر بھلا اور آپ بھلے.....مگر اسماء ہمیں کم از کم اپنے دل تو صاف کر لینے چاہئیں کہ اب خاص طور پر تمہارا ان کے سوا اس دنیا میں رشتے دار ہی کون ہے میں چاہتی ہوں کہ ان کے اس خط کا جواب تم انہیں دو۔''

''میں انہیں جواب دوں'انہیں خط لکھوں.....نہیں نہیں امی جی میں تو اس معاملے میں بالکل کوری ہوں کیونکہ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں نے آج تک کی پوری زندگی میں کبھی کسی کو کوئی خط نہیں لکھا۔ بھلا لکھتی بھی کس کو جب کہ کوئی دوست تھا نہ رشتے دار۔'' اسماء گھبرا کر بولی تو زریں گل کو بھی اس کی بات تسلیم کر لینے پر مجبور ہونا پڑا۔

اصل میں تو ناصرہ بیگم کی فطرت اور مزاج بلکہ رگ و ریشے سے واقف ہونے کی وجہ سے وہ خود بھی ان لوگوں سے کوئی تعلق جوڑنا نہیں چاہتی تھیں مگر چونکہ یہ ان کے مرحوم اور محبوب شوہر کی خواہش تھی اس لیے وہ بیٹی کو اس قدر سمجھا بجھا رہی تھیں۔

ویسے بھی ان دنوں وہ شوہر کی جدائی کے غم کے علاوہ غم روزگار یا مالی افکار میں مبتلا تھیں۔شوہر کچھ ایسا اثاثہ بھی چھوڑ کر نہ گئے تھے کہ جس پر تمام عمر تکیہ کر کے بیٹھ جاتیں۔بس چند ہزار کی رقم پس انداز کر رکھی تھی یا پھر یہ تین سو گز پر تعمیر شدہ مکان تھا جس کی تعمیر کچھ سرکاری قرض سے اور کچھ دس ہزار کی اس رقم سے کی گئی تھی جو وہ اپنے ساتھ لائی تھیں۔وہ بھی فواد کی بہت منت سماجت کرنے اور انہیں سمجھانے بجھانے کے بعد انہوں نے بالآخر فواد کو مکان کی تعمیر پر یہ رقم لگانے کے لیے راضی کر ہی لیا تھا اور زیورات جو بہت ہی مختصر تھے اسماء کی نیت سے اٹھا کر میں رکھوا دیے تھے۔تھوڑی سی رقم کالج کی طرف سے بھی ملی تھی مگر وہ بھی آخر کب تک چلتی۔آمدنی کے ذریعے مسدود ہو جائیں تو بھرے بھرے خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ادھر اپنا اور بیٹی کا کھانا پینا' پہننا اوڑھنا اور دیگر گھریلو اخراجات' اس پر بیٹی کے تعلیمی اخراجات اور جہیز جوڑنے کی فکر۔جیتی جان کے لیے تو اور بھی سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔اس پر مستزاد رفیقے کا ساتھ جسے ایک فیملی ممبر ہی سمجھا جاتا تھا اور جس کا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں تھا ماسوا ان کے چھ سات سال کی عمر کا ان کے گھر آیا تھا۔زریں گل اور فواد نے اسے بڑی محبت سے پالا تھا اور پھر جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا زریں گل اسے سارے کام سکھاتی گئیں حتیٰ کہ کھانا پکانا بھی۔عدت کے بعد شروع شروع میں تو زریں گل نے یہی سوچا تھا کہ وہ کسی سماجی یا رفاہی ادارے میں کوئی ملازمت ڈھونڈ لیں گی لیکن ملازمت کا ملنا ان کے لیے ناممکن نہیں تو محال ضرور تھا کہ ان کے پاس نہ کوئی سند تھی اور نہ ہی میٹرک کا

سٹیفکیٹ تھا اور نہ ہی مہارت اور تجربہ اصل میں تو سب کچھ سفارش پر منحصر تھا کہ سفارش کے بغیر کوئی کام ہی نہیں بنتا اور سفارش کے بل بوتے پر تو ناخواندہ بھی اچھے سے اچھا عہدہ حاصل کر لیتے ہیں۔

اتفاق سے چند ماہ پیشتر ہی اسی محلے میں جس میں زریں گل کا مکان تھا صفیہ بیگم نامی ایک بیوہ خاتون نے ایک انڈسٹریل ہوم کھولا تھا۔ یہ خاتون نہ صرف بہت پرخلوص اور خدا ترس تھیں بلکہ بڑی دین دار بھی تھیں اور اپنے اوپر واجب پڑوسیوں کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے پڑوس کی پوری پوری خبر گیری کرتی تھیں۔ ان کی نیکی اور خلوص کی وجہ سے تقریباً سب ہی ان کی عزت کرتے تھے۔ خود زریں گل اور فواد بھی۔ ہر وقت کا آنا جانا تھا چنانچہ جب زریں گل نے انہیں اپنے ملازمت کرنے کے ارادے سے آگاہ کر کے ملازمت دلوانے کے معاملے میں ان سے مدد چاہی تو انہوں نے زریں گل کو مشورہ دیا کہ ملازمت کرنے کے بجائے وہ ان کے انڈسٹریل ہوم میں اپنی پس انداز کی ہوئی رقم سے چھوٹا سا بوتیک کھول لیں اور وہ مال جو صفیہ بیگم دوسرے دوکانداروں کو سپلائی کرتی تھیں اس میں سے تھوڑا تھوڑا خرید کر اپنے بوتیک میں لگا لیں۔

زریں کو ان کی یہ رائے بہت صائب لگی اور انہوں نے کچھ ہی روز بعد ایک چھوٹا سا بوتیک کھول لیا تھا لیکن جس ذوق وشوق سے کھولا تھا وہ زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکا۔

اصل میں تو زریں گل کی طبیعت شوہر کے انتقال کے بعد سے گری گری سی رہنے لگی تھی۔

جس کی وجہ سے ان کی صحت متاثر ہو کر رہ گئی تھی۔

انہیں اپنے شوہر سے والہانہ عشق تھا۔

ان کا جینا مرنا سب کچھ شوہر کے لیے ہی تھا۔

اور پھر فواد ہی دنیا میں وہ واحد ہستی تھی جنہوں نے سخت مایوس کن اور بدترین حالات میں زریں گل کو سہارا دیا تھا۔

انہیں ٹوٹ کر چاہا تھا۔

ان پر سارا پیار نچھاور کیا تھا۔

ان کے حقوق اور عشق میں کبھی بددیانتی نہیں کی تھی۔ بلکہ پوری صداقت اور وفاداری سے ان کا ساتھ نبھاتے رہے تھے۔

صرف زریں گل کی وجہ سے ہی اپنا شہر اور اپنے بھائی سب کو چھوڑ کر بیٹھے تھے یوں تو تقریباً ہر باوفا اور با محبت عورت کو اپنے شوہر پیارا ہوتا ہے لیکن زریں گل کو تو فواد کچھ اس قدر عزیز اور پیارے تھے کہ وہ ان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں اور اب ان کے بغیر جی رہی تھیں کہ قدرت کے ہاتھوں مجبور تھیں یا پھر ابھی ان کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے گویا زندگی کے ہاتھوں بہت مجبور ہو کے لیکن شوہر کی مفارقت کا داغ اندر ہی اندر ناسور کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ صرف اسماء

کے خیال سے کہ اسے باپ کی موت سے گہرا صدمہ پہنچا تھا اور وہ عموماً باطپ کو یاد کر کے روتی ہی نظر آتی تھیں۔ وہ اپنی اندرونی کیفیات اور کرب کو بیٹی پر ظاہر نہیں کرتی تھیں اور غم کی دھیمی دھیمی آنچ میں اندر ہی اندر پگھلتی جا رہی تھیں۔

اس پر یہ فکر کہ ان کے بعد کا کیا حشر ہوگا ہر دم انہیں ہراساں کیے دیتا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کس طرح اور کس طور پر شوہر کی جدائی میں دو سال کاٹ گئیں۔ عمر بھی ان کی کچھ زیادہ نہ تھی صرف ۳۷ سال ہی تھی اور ان کی خوب صورت اور ترو تازگی میں بھی سر مو فرق نہیں آیا تھا البتہ بیوگی کے بعد جسم قدرے بھاری ضرور ہو گیا تھا۔

مگر دل و جان کو جو ایک روگ لگ گیا تھا وہ بالآخر ایک دن انہیں لے ہی ڈوبا اور وہ بھی دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر ڈھائی برس بعد اپنے شوہر سے جا ملیں اور اسماء سچ مچ بالکل تنہا اور بے یار و مددگار رہ گئی جب کہ زریں گل کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اسماء کے فرض سے سبکدوش ہو لیں۔ مگر قدرت کو شاید یہ بات بھی منظور نہیں تھی۔

زریں گل کو تو اتنا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اسماء کو صفیہ بیگم کی سرپرستی میں دے دیتیں۔ یہ ذمہ داروں تو خود صفیہ بیگم نے ہی اپنے سر لی تھی جسے وہ بحسن خوبی اب تک نبھاتی چلی آ رہی تھیں یعنی اسماء کو تعلیم بھی دلوا رہی تھیں اور کھلا پلا بھی رہی تھیں۔

صفیہ بیگم کی اپنی بھی تین اولادیں تھیں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔

بڑی لڑکی کی انہوں نے شادی کر دی تھی مگر چھوٹی لڑکی چونکہ پیدائشی طور پر پیروں سے معذور تھی اس لیے جوان، خوش شکل اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اب تک کنواری ہی بیٹھی تھی اور لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر مزید تعلیم کے لیے انہوں نے اسٹیٹس بھیج دیا تھا مگر وہ وہاں ایک امریکن لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بار سجا کر بیٹھ گیا تھا صرف ایک مرتبہ بیوی کے ساتھ ماں سے ملنے آیا تھا پھر کبھی آنے کی توفیق ہی نہ ہوئی تھی البتہ گاہے بگاہے تھوڑی بہت رقم ضرور بھیج دیتا تھا۔

زریں گل کے انتقال کے دو ماہ بعد ملک جواد کو جب بھاوج کے انتقال کی خبر ملی تو یتیم و یسیر بھتیجی کے لیے ان کی ممتا یکلخت پھڑک اٹھی۔ اپنی زیادتیوں اور ظلم کا تو بہت پہلے ہی انہیں احساس ہو چکا تھا اور تبھی سے وہ بھائی سے ملنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ بھائی کی زندگی میں ہی انہوں نے بڑی کوشش کی تھی کہ بھائی سے مل کر اپنی زیادتیوں کی معافی مانگ لیں اور اسی کوشش میں انہوں نے بھائی کو کئی خط لکھے تھے۔ دوستوں اور رشتہ داروں کے ذریعے کہلوایا بھی تھا کہ وہ ان سے ملنے کے لیے بیقرار ہیں مگر فواد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اصل میں تو فواد کی طرف سے بھائی کے لیے دل میں ذرا میل نہ تھا بس جو کچھ تھا رنجش، کبیدگی، برائی خفگی سب کچھ بھاوج کی طرف سے تھا کیونکہ وہ اپنے بھائی سے زیادہ اپنی بھاوج کی عیارانہ فطرت اور رگ و ریشے سے واقف تھے مگر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنی حالت کے پیش نظر ان کے خیالات پلٹے تو وہ بھی اپنے بھائی سے ملنے کے لیے تڑپنے لگے مگر قدرت کو دونوں کا میل منظور ہی نہیں ہوا۔

اصل میں تو ساری چالاکی ناصرہ بیگم کی تھی کہ انہوں نے اپنے شوہر کو وہ تار بھی نہیں دکھایا تھا جو فواد کے انتقال سے متعلق زریں گل نے انہیں بھجوایا تھا۔ پتا بھی چلا تو دو ڈھائی ماہ بعد وہ بھی پرویز ملک کے بڑے داماد کی زبانی جو ملتان میں ہی رہتے تھے اور اپنی بیوی فوزیہ کے ساتھ اکثر و بیشتر ملک فواد کے یہاں جایا کرتے تھے۔

بھائی کے انتقال کی خبر وہ بھی اس قدر تاخیر سے ملنے پر ملک جواد کو اتنا شدید صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ڈپریشن کا شکار ہو گئے تھے۔

باپ کی وصیت
بھائی کی حق تلفی

اپنی زیادتیاں اور کوتاہیاں
بیوی کے جور و ستم
اس پر دائمی جدائی کا احساس

اف ایک بات ہوتی تو وہ اس کے لیے اپنے طور پر دلائل پیش کر کے اسے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش بھی کرتے مگر وہاں تو جس وقت سے ان کی شادی ناصرہ بیگم سے ہوئی اس وقت سے اب تک یعنی ۳۲، ۳۳ برسوں میں پھیلے ہوئے کسی ایک پل کا حساب بھی صاف نہ تھا۔

بیوی کی اصلیت تو بہت پہلے ہی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔
مگر اب تو وہ ان کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔

بھائی کی دائمی مفارقت کا صدمہ ایک سانحہ بن کر ٹوٹا تو وہ بستر ہی سے جا لگے اور اسی حزنی سی کیفیت میں انہوں نے بھاوج کو بھائی کی عزیت دینے کے ساتھ ساتھ اپنی ساری زیادتیوں اور کوتاہیوں سے متعلق ایسا درد بھرا خط لکھا کہ بھاوج کے آئینے کی طرف شفاف دل پر پڑی ان کی کبیدگی کی گرد پل کے پل میں صاف ہو گئی مگر وہ اپنے حالات میں گرفتار تھیں۔ خط کا جواب تو دے دیا تھا لیکن ناصرہ بیگم نے ان کا وہ خط ملک جواد تک پہنچنے ہی کہاں دیا بلکہ الٹا دیورانی کے خاف زہر ہی اگلتی رہیں اور انہیں ہی اس ساری رنجش کا ذمہ دار ٹھہراتی رہیں اور ملک جواد یہی سمجھے کہ بھاوج ملنا ہی نہیں چاہتی۔ جب بھائی ہی نہ رہا تو بھاوج اور بھتیجی سے کیا واسطہ انہوں نے یہی سوچ کر خاموشی اختیار کر لی۔

☆ ☆ ☆